فہرست

دیباچہ:

دیباچہ برائے جلد 2

الحمد للّٰہ ربّ العالمین، جس نے ہمیں علم کی جستجو کی توفیق عطا فرمائی اور ہدایت کے روشن راستے دکھائے۔ یہ جلد 2، "مائی ورک آن اسلام" اسی کوشش کا نتیجہ ہے جس میں قرآن و حدیث

کے اصول، فقہی اور اجتہادی مسائل، اور اسلامی

نظریات کی جامع توضیح پیش کی گئی ہے۔

اس جلد میں احادیث کی اہمیت، ان کی حقیقت،

اور ان کے ساتھ تعلق رکھنے والے علمی اصولوں کو

واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ساتھ ہی یہ

بتایا گیا ہے کہ کس طرح نبی کریم ﷺ کی

اجتہادی فہم اور فقہ ہمارے لیے حجت و رہنمائی کا

سبب بنتی ہے، اور کس طرح اللہ کے احکامات اور

قوانین کی مکمل تابعداری ایمان اور عمل کے لئے

لازمی ہے۔

قاری کے لیے یہ دیباچہ ایک چھوٹا تعارف ہے، تاکہ

وہ اس کتاب کے مواد کو بہتر انداز میں سمجھے

اور اس کے فلسفہ و مقصد سے روشناس ہو۔ اللہ

تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ علمی و فکری کوشش قاری

کے دل و دماغ میں روشنی ڈالے اور اس کے عمل و

ایمان کو مضبوط بنائے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

- قبر سٹیج یا برزخ زندگی والے ہماری پکار سے قیامت تک غافل ہے؟

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ۝٥

ترجمہ46:5 :

اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوسکتا ہے جو
ایسے کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہ دے
سکے اور انکو ان کے پکارنے ہی کی خبر نہ ہو ؟

یہ آیت خاص برزخ زندگی میں رہنے والوں کے
بارے میں ہے ۔ کیونکہ "الی یوم القیامہ" کی قید
لگائی گئی ہے ۔ بت عادۃً ہمیشہ جواب نہیں دے
سکتے اور غافل ہے اور آیت کریمہ میں قیامت تک
کی قید لگائی گئی ہے۔ فرشتے تاحال بھی جواب دے
سکتے ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے مفہوم: کہ جب

غائب بھائی کے لئے دعا کی جائے تو فرشتے آمین

کہتے ہیں اور کہتے ہیں تمھارے لئے بھی ایسا ہو۔

زندہ انسان بھی جواب دے سکتے ہیں ۔ اور اگر یہ

کہا جائے کہ اللّٰہ کی مشیت کے بغیر جواب نہیں

دے سکتے تو وہ بھی ہمیشہ نہیں دے سکتے ،

قیامت تک کی قید لگانے کی ضرورت نہیں تھی پھر

--

لہٰذا یہ آیت خاص برزخ زندگی میں رہنے والوں کے

بارے میں ہے ۔

اس آیت میں اور مناسب احتمال نہیں ہے اس لئے

یہ آیت ایک قطعی دلیل ہے اور اس لئے اس آیت

سے کسی کو مستثنیٰ کرنے کے لئے یا تو قرآن کی

آیت کی ضرورت ہے یا پھر متواتر حدیث کی ۔

جو خبر واحد احادیث مذکورہ آیت کے خلاف ہو ان

احادیث میں مناسب تاویل کیا جائے گا ۔ مثلاً

تمہارا درود مجھ ﷺ پر پیش کیا جاتا ہے ۔

یہ حدیث سوال مقدرہ کا جواب ہے۔ کیا درود آپ

ﷺ کی زندگی پر خاص ہے یا وفات کے بعد بھی

درود شریف کا ایصال ثواب پہنچے گا، اسی کا جواب

دیا گیا ہے کہ تمھارا درود مجھ ﷺ پر پیش کیا

جاتا ہے ۔ یعنی ایصال ثواب پہنچتا ہے یعنی درجات

بلند کئے جاتے ہیں ۔ ضائع نہیں جاتا --

اسی طرح ہفتے سے جمعرات تک درود شریف جمع

کئے جاتے ہیں اور جمعے کے دن پیش کئے جاتے

ہیں یعنی درجات بلند کئے جاتے ہیں ۔

یہ مطلب نکالنا کہ نبی ﷺ کو پتہ چل جاتا ہے

کہ فلاں نے درود شریف مجھ ﷺ پر پڑھا ہے ۔

یہ مذکورہ آیت کے بھی منافی ہے اور حدیث کے

بھی جس میں نبی ﷺ نے فرمایا کہ میں قیامت

کے دن اپنے بھائی عیسیٰ علیہ السلام کی طرح گواہی

دوں گا کہ جب تک ان میں موجود تھا میں خبر

رکھتا تھا جب تو نے وفات کیا پھر تو ہی نگران

تھا۔۔

اگر مذکورہ آیت سے نبی کریم ﷺ مستثنیٰ ہوتے

تو نبی ﷺ قیامت کے دن یوں گواہی دیتے کہ

فلاں مجھ پر درود پڑھتا تھا باقی مجھے نہیں پتہ ۔۔

جو احادیث مذکورہ آیت کے صریحی خلاف ہے اور

ان میں مناسب تاویل بھی نہیں کیا جا سکتا تو وہ

احادیث ضعیف ہوں گے ان کے سند کو دیکھنے کی

ضرورت نہیں ہے ۔

کسی شخص کو دعا کے لئے کہنا کہ میرے لئے اللہ

سے مغفرت طلب کریں جائز ہے ۔

عمر رض نبی ﷺ کو دعا کے لئے کہتے جب آپ

ﷺ وفات پا گئے تب عباس رض کو دعا کے لئے

کہتے ۔

اگر نبی ﷺ مذکورہ آیت سے مستثنیٰ ہوتے تو آپ

ﷺ کے قبر کے قریب دعا کے لئے کہنا جائز

ہوتا۔۔ لیکن عمر رض نے نبی ﷺ سے دعا طلب

نہیں کی ۔ یہ ایک واضح دلیل ہے کہ نبی ﷺ

مذکورہ آیت سے مستثنیٰ نہیں ہے ۔

برزخ زندگی میں رہنے والے اس دنیا میں رہنے والے کی

پکار کا عادۃً جواب نہیں دے سکتے ، جواب تو کیا

قیامت تک غافل ہے ۔

غفلت کی کئی وجوہات ہو سکتی ہے ۔ یا تو انسان

مصروف ہوتا ہے، یا ہماری ساؤنڈ فریکوئنسی ان کے

لئے آڈیبل نہیں ہوتی یا دور ہوتا ہے۔

لیکن مذکورہ آیت کہتا ہے کہ غافل یقینی ہے ۔

اب اس بات کا کوئی فائدا نہیں ہوا کہ برزخ

زندگی میں رہنے والے کو ہماری آواز عادۃً سنائی دیتی

ہیں یا نہیں کیونکہ اگر سنائی دیتی بھی ہے تو فائدا

کیا ہوا جب غافل ہے ۔ اور قرآن وہ بات نہیں

بتاتا جس کا فائدا نہ ہو۔ اس لئے قرآن نے صاف

لفظوں میں یہ نہیں کہا کہ انہیں سنائی دیتی ہیں

یا نہیں ۔

نوٹ:

ایک اصل حقیقت ہوتی ہے جسے اللّٰہ ہی بہتر جانتا

ہے اور ایک بقدر ضرورت حقیقت ہوتی ہے جو عقل

سلیم اور محکمات کے مطابق ہوتی ہے ۔ مذکورہ

مفہوم بقدر ضرورت حقیقت ہے ۔ جبکہ برزخ زندگی

کی اصل حقیقت کے بارے میں اللّٰہ تعالیٰ نے "لا

تشعرون" کا صیغہ لگا دیا ہے ۔ یعنی متشابہات میں

سے ہے ۔

میرے نزدیک بعض اہل علم برزخ زندگی کی اصل

حقیقت کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ

برزخ زندگی اور جنت کی زندگی بہت مختلف ہے کہ

حدیث میں ہے مفہوم: جنت میں ایسی نعمتیں ہیں

کہ کسی انسان نے اس کا تصور بھی نہیں کیا ہے۔

برزخ زندگی کی بقدرِ ضرورت حقیقت کا مقصد یہ

ہے کہ برزخ زندگی میں رہنے والوں کو دعا کے لئے

کہنا لغو اور فضول کام ہے۔ اللّٰہ کو راضی کرنے کے

وہ طریقے اپنائیں جو قرآن و حدیث سے ثابت ہے ۔

رہی بات حیات اور موت کی ۔ تو یہ قرآن میں

کئی معنی پر استعمال ہوا ہے ۔

روح اور دنیاوی بدن جب ملے ہو اور نیکی کا موقع

میسر ہو تو اس کو عادۃً حیات کہتے ہیں اور جب

روح دنیاوی بدن سے جدا ہو کر پرندے کے جوف

میں چلا جائے اور نیکی اور ایمان کا موقع ختم ہو

جائے تو اس کو عادۃً موت کہا گیا ہے ۔

مقصد کی زندگی گزارنے کو حیات کہا گیا ہے ۔ اور

بے مقصد زندگی گزارنے کو موت کہا گیا ہے ۔

شہید مر کر بھی نیکیاں کما رہا ہے یعنی مقصد کی

زندگی گزار رہا ہے اس لئے زندہ ہے --

آخرت میں زندگی کا مقصد جنت ہے اور جہنمی

چونکہ بے مقصد زندگی گزار رہا ہے اس کے بارے

میں فرمایا گیا ہے کہ ان کو نہ دھریہ والا موت

آنی ہے کہ ہمیشہ کے لئے فنا اور غیر موجود ہو

جائے اور نہ اصل موت جس میں جدائی ہوتی ہے

یعنی جہنم سے جدا نہیں ہوں گے اور نہ زندگی

زندگی جیسی ہوگی بے مقصد زندگی جو گزار رہے ہوں

گے ۔ (اِنَّهٗ مَنۡ يَّاۡتِ رَبَّهٗ مُجۡرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ‌ؕ لَا

يَمُوۡتُ فِيۡهَا وَ لَا يَحۡيٰى۝ 20:74

برکات والی نعمتوں اور خوشحالی میں رہنے کو حیات

کہا گیا ہے جیسے کہ شہداء برکات والی نعمتوں میں

جی رہے ہیں تو اس کے بارے میں فرمایا گیا کہ

ان کو اموات نہ کہنا بلکہ احیاء کہنا کہ خوب

نعمتوں کے سرور میں ہے ۔

رہی وہ موت جو انسان کے کامن سینس میں ہوتا ہے

اس کا وجود ہی نہیں ہے یہ تو دھریہ کا نظریہ ہے

کہ بس فنا اور غیر موجود ہو جائیں گے ۔

موت میں اصل چیز عارضی جدائی ہے اور نیکی کا

موقع گنوانا ہے۔ باقی تقریباً سب اوہام ہے۔ مثلاً

میری اولاد کا کیا ہوگا ۔۔ تو تمھاری اولاد کا پہلے

بھی اللّٰہ ہی رب تھا اور آئندہ بھی اللّٰہ ہی رہے گا

وغیرہ ۔۔

واللہ تعالیٰ اعلم

آخرت کے بارے میں صحیح اور غلط نظریہ

یہود و نصاریٰ کو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لانے
کی ترغیب دی گئی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ تو اللہ اور آخرت کو مانتے ہیں، تو پھر کیوں ان کو آخرت پر ایمان کی ہدایت دی گئی؟

جواب:

ان کا اللہ کی معرفت میں بھی خلل تھا اور آخرت کو اپنی مرضی کے مطابق سمجھتے تھے۔

یہود کا آخرت کے بارے میں نظریہ یہ تھا کہ بس

کچھ دن جہنم میں رہیں گے اور پھر ویسے بھی

نکل جائیں گے۔

نصاریٰ کا نظریہ یہ تھا کہ ہم اللہ کے لاڈلے اور

محبوب ہیں، لہٰذا اللہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔

یہ دونوں نظریات ناقص ہیں اور انسان کو گناہوں

کے بارے میں بے پرواہ بناتے ہیں۔ اسی لیے ان کو

اللہ اور آخرت پر صحیح ایمان لانے کی ترغیب دی گئی۔

مومن کا آخرت کے بارے میں نظریہ:

مومن کا نظریہ امید اور خوف کے درمیان متوازن ہوتا ہے۔

امید نیکی کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

خوف گناہوں کو نیکیوں سے مٹانے کی طرف راغب
کرتا ہے۔

مومن گناہ اس امید پر کرتا ہے کہ توبہ کے ذریعے
گناہ مٹایا جا سکتا ہے۔ وہ لمبی اور غیر حقیقی
امید سے پرہیز کرتا ہے۔ اپنی استطاعت کے مطابق
کوشش کرتا ہے کہ اللہ اس کی تقدیر میں اسے
مومن کے طور پر لکھ دے۔

(مثال کے طور پر دل آزاری، چرس یا دیگر

سنگین گناہوں سے پرہیز کرے، کیونکہ ان کا ازالہ

مشکل ہوتا ہے)۔

اس کے برعکس:

یہود گناہ اس لیے کرتے ہیں کہ بس کچھ دن جہنم

میں رہیں گے اور پھر ویسے بھی نکل جائیں گے۔

نصاریٰ گناہ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے لاڈلے

اور محبوب ہیں، لہٰذا معاف کر دیا جائے گا۔

یہ دونوں نظریات انسان کو جانور یا اس سے بھی

بدتر بنا دیتے ہیں، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے کہ

یہ لوگ جانور کی طرح ہیں یا اس سے بھی بدتر۔

نتیجہ:

آخرت پر صحیح ایمان انسان میں بڑا انقلاب پیدا

کرتا ہے۔ اسی لیے ضروری ہے کہ والدین اپنی اولاد

کو صرف آخرت پر ایمان لانے کی تلقین نہ کریں،

بلکہ انھیں آخرت کے بارے میں صحیح اور غلط

نظریات بھی سکھائیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

• آخرت کے بارے میں یہود و نصاری کا نظریہ: گناہ کس نیت سے کرتے تھے ۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝

ترجمہ 5:18:

اور یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللّٰہ کے لاڈلے اور محبوب ہیں ۔ کہو کہ پھر وہ تمہاری

بداعمالیوں کے سبب تمہیں عذاب کیوں دیتا ہے ؟

(نہیں) بلکہ تم اس کی مخلوقات میں (دوسروں کی

طرح کے) انسان ہو۔ وہ جیسے چاہے بخشے اور جسے

چاہے عذاب دے اور آسمان اور زمین اور جو کچھ

ان دونوں میں ہے سب پر اللّٰہ ہی کی حکومت ہے

اور (سب کو) اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ

اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ

تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ َ

ترجمہ2:80:

اور (یہود) کہتے ہیں کہ (دوزخ کی) آگ ہمیں چند

روز کے سوا چھو ہی نہیں سکے گی، ان سے پوچھو

کیا تم نے اللّٰہ سے اقرار لے رکھا ہے (کہ گناہوں پر

چند دن سے زیادہ عذاب نہیں دیں گے) کہ اللّٰہ اپنے

اقرار کے خلاف نہیں کرے گا ؟ (نہیں) بلکہ تم

خدا کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہو جن کا

تمہیں مطلق علم نہیں

—

عہد کس کے ساتھ ہے؟

غَافِرِ الذَّنۡۢبِ وَقَابِلِ التَّوۡبِ شَدِيۡدِ الۡعِقَابِ ذِى الطَّوۡلِ‌ؕ لَاۤ

اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ؕ اِلَيۡهِ الۡمَصِيۡرُ ۞ ◌ُ

ترجمہ:

گناہ بخشنے والا توبہ قبول کرنے والا سخت عذاب

دینے والا بڑا ہی فضل والا ہے کوئی بھی عبادت کے

لائق نہیں سوائے اس (وحدہ لاشریک) کے اسی کی

طرف بہرحال لوٹنا ہے سب کو

غافر – 3

غَافِرِ الذَّنۡۢبِ وَقَابِلِ التَّوۡبِ (لمن قال لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ)

شَدِيۡدِ الۡعِقَابِ (لمن کفر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ)

واللہ تعالیٰ اعلم

ہم اللہ کے محبوب ہیں

یہ جملہ بذاتِ خود مذموم نہیں ہے۔

اس کا مذموم پہلو صرف اس وقت ہے جب کوئی
شخص اس کے بہانے گناہوں پر نڈر ہو جائے اور
توبہ و اصلاح سے کنارہ کشی اختیار کرے۔

اصل میں یہ جملہ نیکی اور توبہ کی ترغیب کے لیے
قابلِ تعریف ہے۔ بعض اوقات انسان جب نیکی اور
توبہ کی طرف مائل ہوتا ہے تو شیطان وسوسے دیتا ہے
کہ ”اتنے گناہ کرنے کے بعد تیری نیکی کا کیا
فائدہ؟“ اس موقع پر یہ جملہ، اللہ کی مغفرت اور
رحمت والی آیات و احادیث کی صدا انسان کے دل

میں پہنچتی ہے کہ ''تیری نیکی اللہ کے ہاں بے حد

قیمتی ہے، چاہے ہزار گناہوں کے بعد ہی کیوں نہ ہو،

اور آئندہ بھی گناہ کا ارادہ کیوں نہ ہو''۔

اس سے انسان کی ہمت اور توجہ نیکی اور توبہ کی

طرف بڑھتی ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

- حاکمیت:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

ترجمہ 5:44:

۔ اور جو خدا کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہ دے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

ترجمہ5:45:

اور جو خدا کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے

مطابق فیصلہ نہ دے تو ایسے ہی لوگ بے انصاف

ہیں۔

وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ

الۡفٰسِقُوۡنَ۝ ◌َ

ترجمہ5:47:

اور جو خدا کے نازل کئے ہوئے احکام کے مطابق

فیصلہ نہ دے گا تو ایسے لوگ نافرمان ہیں۔

للہ کے قوانین کے علاوہ کسی اور کے قوانین کو

حق سمجھ کر قبول کرنا کفر ہے۔

یا یہ کہنا کہ اللہ کا قانون ہو یا مخلوق کا، اس

میں کوئی فرق نہیں پڑتا، یہ بھی کفر ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان اللہ کے فیصلے

اور مخلوق کے فیصلے کو برابر سمجھتا ہے، تو اس

نے حاکمیت میں مخلوق کو اللہ کے ساتھ شریک کر

دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تقدیر میں جو کچھ ہوتا ہے

وہ اللہ کے فیصلے کے مطابق ہوتا ہے، نہ کہ مخلوق
کے فیصلے کی وجہ سے۔

بظاہر بعض اوقات مخلوق کا فیصلہ اللہ کے فیصلے
کے موافق ہو کر ویسا ہی ہو جاتا ہے، لیکن اصل
میں یہ اتفاق محض مجازاً ہوتا ہے۔ مخلوق کے
فیصلے کی حیثیت صرف ایک وسیلہ یا مجاز ہے،
حقیقت میں سب کچھ اللہ کے حکم سے ہی ہوتا
ہے۔

ایک اور اہم اور باریک بات یہ ہے کہ اگر انسان

کا بنایا ہوا قانون بالکل اللہ کے قانون کے مطابق

ہو، لیکن اس پر عمل کو انسان کے قانون کی وجہ

سے حق سمجھا جائے نہ کہ اللہ کے قانون کی وجہ

سے، تو یہ بھی شرک ہی ہے۔ اس کو شرک فی

الحاکمیت کہا جاتا ہے۔

(اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ)

یوسف – 40

اصل بات یہ ہے کہ مخلوق کے حکم کو ماننا در

حقیقت اللہ کے حکم کی وجہ سے مانا جاتا ہے۔ ہم

صرف اللہ کے حکم کے پابند ہیں اور اسی کو حق

سمجھیں گے۔

مثلاً اللہ فرماتا ہے:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ (4:59) ◌َ

"اللہ کے احکامات تسلیم کرو"۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تو ہم سے براہِ

راست کلام نہیں کرتا، تو کیسے جانیں گے کہ اللہ

کے احکامات کیا ہیں؟ جواب یہ ہے کہ اللہ کے

احکامات آسمانی کتابوں میں موجود ہیں، اور آخری

پیغمبر ﷺ پر جو اتارا گیا وہ قرآن و حدیث

کے ذریعے ہے:

وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (4:59) ◌َ

"رسول اللہ ﷺ کے احکامات تسلیم کرو"۔

رسول اللہ ﷺ کے احکامات کو قرآن و حدیث کے

ذریعے اللہ کے احکامات سمجھا جاتا ہے۔ مزید کہا

گیا :

وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (4:59) ۚ

یعنی حکم والے افراد، جیسے حضرت محمد ﷺ،

بادشاہ، ماں باپ، خاوند، مالک وغیرہ کے جائز

احکامات، اصل میں اللہ کے احکامات ہیں۔ ان کے

جائز احکامات پر عمل کرنا در حقیقت اللہ کے

احکامات پر عمل کرنا ہے۔

اللہ کی ربوبیت ایسی ہے کہ وہ ماں باپ، خاوند،

وغیرہ کے جائز احکامات تمہارے فائدے کے لیے

جاری کرتا ہے۔ جب ناجائز احکامات جاری ہوں تو

اس میں امتحان ہوتا ہے۔

نوٹ:

اللہ کے قوانین اور احکامات کو حق سمجھتے ہوئے

عمل نہ کرنا گناہ ہے، لیکن کفر یا شرک نہیں۔

مخلوق کے ناجائز حکم کو ناحق سمجھ کر عمل

کرنا بھی گناہ ہے، لیکن کفر یا شرک نہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

- حاکمیت کا مسئلہ:

1. اگر کوئی شخص کسی پر صرف اللہ کا فیصلہ

نافذ کروانا چاہتا ہے، لیکن اس کی نیت اللہ کی

رضا کی بجائے ذاتی انتقام یا دیگر مقاصد ہے، تو
یہ عمل کراہت کے ساتھ جائز ہے۔

2. اگر کوئی شخص اپنی خواہش کا فیصلہ نافذ
کروانا چاہتا ہے اور اسے حق بھی سمجھتا ہے، تو یہ
شرک فی الحاکمیت ہے، چاہے اس کا فیصلہ بظاہر
اللہ کے فیصلے کے مطابق بھی ہو۔ کیونکہ یہ
موافقت اتفاقاً ہے؛ اس شخص کا اللہ کے فیصلے سے
کوئی تعلق نہیں۔ اگر اللہ کا فیصلہ کچھ اور ہوتا

تب بھی وہ اپنی خواہش کا فیصلہ نافذ کرتا۔ اسی

لئے قرآن میں ارشاد ہے:

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا

ترجمہ: پس تم انصاف کرنے میں خواہش کی پیروی

نہ کرو۔ (النساء: 135)

اگر کوئی اپنی خواہش کے فیصلے کو ناحق سمجھتا ہے اور اس کے مطابق عمل کرتا ہے، تو شرک نہیں ہے۔

اجتہاد کی حیثیت:

مجتہد اپنی اجتہاد میں اللہ کے فیصلے تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے، نہ کہ اپنی خواہش کو نافذ کرنے کے لئے۔ اگر اجتہاد میں خطا ہو جائے، تو اس کی کوشش پر اجر لکھا جاتا ہے اور خطا معاف ہے، کیونکہ انسان اپنی استطاعت کے مطابق مکلف

ہے۔ اگر حق تک پہنچ جائے، تو دگنا اجر ملتا ہے:

ایک کوشش کے لئے اور دوسرا حق تک پہنچنے کے

لئے۔

بعض احادیث قرآن کی طرح مستقل وحی کے ذریعے

نازل کی گئی ہیں، اور اسی نازل شدہ قرآن و

حدیث میں خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کا

اجتہاد بھی حدیث کہلاتا ہے۔ اللہ نے ان کی مطلق

تابعداری کا حکم دیا ہے، بغیر کسی شرط کے کہ

اجتہاد میں خطا ہو تو تابعداری نہ کی جائے۔ اس لئے نبی ﷺ کا اجتہاد بھی حجت اور دلیل ہے۔

نبی کریم ﷺ کو دو اعمال میں اختیار دیا جاتا تو اللّٰہ کے خوف سے آسان عمل منتخب کرتے کہ قرآن میں ارشاد ہے مفہوم: دین میں تنگی نہیں ہے ۔

اپنی خواہش کے لئے آسان عمل منتخب کرنا اور اللّٰہ کے لئے آسان حکم منتخب کرنے میں فرق ہے ۔

واللہ تعالیٰ اعلم

توحید کا پیمانہ:

توحید کا بنیادی پیمانہ یہ ہے: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه۔

اگر اللہ کے سامنے بندگی کے علاوہ کوئی اور اختیار یا آپشن موجود ہو، تو اس سے توحید میں نقصان ہوتا ہے۔

اللہ کے حضور گھٹنے ٹیکنے کے طریقے قرآن و حدیث

میں واضح کئے گئے ہیں۔ خود سے ایجاد کردہ طریقے،

یعنی بدعت، اللہ کو منظور نہیں ہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

نیت اور اخلاص

نیت:

إِنَّمَا الْأَعْمَال بِالنِّيَّاتِ (بخاری و مسلم)

ترجمہ: (جائز) اعمال (کے ثواب) کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

مثالیں:

ایک شخص کھونٹی زمین میں گاڑ رہا ہے تاکہ لوگ

سواری اس پر باندھیں اور اس طرح اللہ راضی ہو

جائے، تو اس نیت پر ثواب ملے گا۔

ایک شخص کھونٹی اس لیے گاڑ رہا ہے کہ کوئی

اس پر گر جائے، تو اس نیت کی وجہ سے اس

عمل پر گناہ ہوگا۔

نوٹ: عمل کا جائز ہونا ضروری ہے، پھر نیت کا صحیح ہونا اہمیت رکھتا ہے۔

متعدد نیتیں:

ایک عمل میں متعدد نیتیں کی جا سکتی ہیں۔

مثال کے طور پر، ایک شخص سیر و تفریح کے لیے نکلتا ہے تو اسے سیر و تفریح کا فائدہ حاصل ہوگا۔ ساتھ ہی اگر وہ پڑوسیوں کا حال معلوم کرنے، مدد کرنے، راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانے، سلام کا

جواب دینے وغیرہ کی نیت بھی کرے، تو ان سب کا اجر ملے گا۔

نیت میں واسطے:

اگر نیت میں واسطے شامل ہوں اور یہ واسطے اللہ تک پہنچیں، تو اس نیت کا اجر ملے گا۔ مثال:

کوئی اہل بیت سے محبت کرتا ہے کیونکہ محمد ﷺ کی وجہ سے اور محمد ﷺ سے محبت کرتا ہے اللہ کی وجہ سے، تو یہ نیت اجر کے قابل ہے۔

اگر محبت صرف لوگوں کی تعریف کے لیے ہو تو یہ نیت چونکہ اللہ تک نہیں پہنچتی اس لئے اجر نہیں ملتا، بس لوگوں سے "عاشق رسول ﷺ" کہلائے گا۔

اسی طرح خدمت خلق یا ماں باپ کو جائز طریقے سے راضی کرنا اگر واسطے اللہ تک پہنچیں، تو اجر

ملے گا۔ ورنہ دنیاوی فائدہ ممکن ہے، لیکن آخرت

کے مقابلے میں کم ہے۔

دنیاوی نعمتوں کی حقیقت:

مومن دنیا کی نعمتوں پر خوش اور راضی ہوتا ہے،

لیکن مطمئن نہیں کیونکہ اللہ کی معرفت حاصل ہے

اور آخرت کی لازوال نعمتیں بہتر ہیں۔ اس لیے

مومن آخرت کی تیاری کرتا ہے۔

اخلاص:

اللہ کی رضامندی کی طلب کو اخلاص کہتے ہیں۔

خالص اللہ سے اجر کی امید رکھنا اخلاص ہے۔

مخلوق سے اجر کی امید رکھنا اخلاص کے منافی ہے،

جیسے ریاکاری، جسے شرک اصغر کہا گیا ہے۔

قیامت کے دن ریاکار کو کہا جائے گا جاؤ جن کے

لئے دکھاوا کرتے تھے انہی سے اجر و بدلہ حاصل

کرے۔

وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۙ﴿﴾ الشعراء – 84

ترجمہ: اور بعد کے آنے والوں میں مجھے سچی

ناموری عطا فرما۔

ابراھیم علیہ السلام نے اللہ سے دعا مانگی لیکن یہ

محمود ہے کیونکہ ابراھیم علیہ السلام نے اللہ کو

عزت دینے کا اختیار مند سمجھا ۔

اسی طرح، اگر پانی پینے کی نیت یہ ہو کہ پانی

(مخلوق) میری پیاس بجھائے، تو یہ اخلاص کے

منافی ہے، کیونکہ اجر کی امید اللہ سے نہیں بلکہ
مخلوق (پانی) سے وابستہ ہے۔ یہ نظریہ اور عمل
دونوں دھریہ کی مانند ہیں۔

اگر پانی پینے کی نیت یہ ہو کہ اللہ میری پیاس
بجھائے، تو یہ اخلاص ہے، کیونکہ نظریں اور
امیدیں اللہ سے وابستہ ہیں۔ دھیان رہے کہ بدلہ تو
پیاس بجھانا ہی تھا، لیکن نیت کی درستگی کی وجہ
سے یہ اخلاص کے قابل ہے۔

اس میں تھوڑی کمی یہ ہے کہ اللہ کی معرفت کے
بارے میں کامل ادراک نہیں ہے؛ یعنی صرف معمولی
اجر کی امید رکھنا ناقص معرفتِ الٰہی کی نشانی ہے۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ پانی پیتے وقت اللہ سے
لازوال اجر کی امید رکھی جائے، تاکہ پیاس بجھانا
اللہ کی رضامندی کا باعث بنے۔ مخلصین کم اجر
پر اکتفا نہیں کرتے، کیونکہ انہیں اللہ کی بقدرِ
حق معرفت حاصل ہے اور اللہ کی رضامندی سے بڑھ
کر کچھ نہیں۔ اس لیے وہ ہر نعمت ایسی مانگتے

ہیں کہ اللہ کی رضامندی کا سبب بنے، یعنی بابرکت نعمت کی طلب رکھتے ہیں۔

اخلاص کے حصول کا طریقہ:

حقیقی وجہ اللہ کی خصوصی رحمت اور توفیق ہے،

لیکن ظاہری اسباب میں شامل ہیں:

1. اللہ کی بقدرِ حق معرفت حاصل کرنا۔

2. اس دعا میں غور کرنا: قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا...

(اعراف - 23)

3. عمل کو بذاتِ خود حسن یا قباحت نہ سمجھنا،

بلکہ اجر و بدلہ اللہ سے توقع رکھنا۔

مثال:

جہاد میں صرف دنیاوی فائدہ چاہنا اجر کے لیے ناکافی ہے۔

اللہ سے لازوال اجر کی طلب رکھنا، دنیاوی بدلہ بابرکت طلب کرنا، اور ہر عمل میں اللہ کی رضامندی کو ترجیح دینا۔

خلاصہ:

نیت کا اصل مرکز اللہ کی معرفت ہے۔

اخلاص میں دنیاوی نعمتوں کا طلبگار ہونا منع نہیں، لیکن اللہ کی رضامندی (لازوال اجر) کو ترجیح دینا ضروری ہے۔

تقدیر کے استعمال کے مطابق عمل کو غیر موثر سمجھ کر توکل اور اخلاص اختیار کیا جائے، اور اجتہاد میں عمل میں حسن اور قباحت کی تلاش کی جائے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

خدمت

خدمت دو طرح کی ہوتی ہے:

1. فرض

2. نفل

1) فرض

فرض کی بھی دو قسمیں ہیں:

الف) فرض عین

ب) فرض کفایہ

الف) فرض عین:

اگر ایک شخص نے کسی عورت کو تنخواہ کے عوض خادمہ بنایا ہے، تو اس عورت پر مناسب خدمت کرنا اس کے لیے فرض عین ہے۔ شرعی عذر کے بغیر خدمت نہ کرنے کی صورت میں وہ گناہگار ہو جائے گی، چاہے وہ شخص اپنی خدمت خود کر سکتا ہو۔

ب) فرض کفایہ:

اگر کوئی شخص بیمار ہو یا حلال رزق کمانے میں
اتنا مصروف یا تھکا ہوا ہو کہ وہ اپنی خدمت خود
نہیں کر سکتا، تو اس کی خدمت کرنا فرض کفایہ
ہے۔ یہ ذمہ داری پہلے قریبی رشتہ داروں، پھر
پڑوسیوں پر مشترکہ طور پر عائد ہوتی ہے، جیسے کہ
اولاد یا بہو وغیرہ۔

عورت پر بہو ہونے کے ناطے سسر اور ساس کی
خدمت فرض عین نہیں ہے البتہ انسانیت کے ناطے

فرض کفایہ ہے ان کاموں میں جو سسر اور ساس

نہیں کر سکتے بیماری کی وجہ سے یا مال کمانے

کی وجہ سے ۔ یہ خدمت اولاد اور بہو پر مشترکہ

فرض ہے۔

مثال کے طور پر، اگر بیماری یا کام کی وجہ سے

سسر یا ساس اپنی خدمت نہیں کر سکتے، تو اولاد

اور بہو پر مشترکہ فرض ہے۔ اگر ایک نے خدمت

کی تو فرض ادا ہو جاتا ہے اور اس خادم کو اجر

ملتا ہے، اور اگر کوئی بھی نہ کرے تو سب گناہگار

ہوں گے۔

2) نفل خدمت

اگر کوئی شخص اپنی خدمت خود کر سکتا ہو لیکن

پھر بھی اس کی خدمت کی جائے تو یہ مستحب

ہے۔

انسان کو نیکی کے کاموں میں مصروف رہنا ضروری

ہے، کیونکہ جو اللہ کی یاد سے غافل رہتا ہے اور

نیکی کے کاموں میں مشغول نہیں ہوتا، اللہ فرماتا

ہے کہ اس کا شیطان دوست بن جاتا ہے۔ مشاہدے

سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو عورت کام نہیں کرتی

اور نیکی کے کاموں میں مصروف نہیں رہتی، وہ

خاندان میں اختلاف اور لڑائی پیدا کر سکتی ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

تین طلاقیں اور جان بوجھ کر حلالہ

تین طلاقیں ایک ساتھ دینا بدعت ہے اور دین کے ساتھ مذاق کے مترادف ہے۔ اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تعزیری سزا کے طور پر تین طلاقیں مقرر کیں، تاکہ لوگ تین طلاقیں دینے سے باز رہیں، نہ کہ صرف تین طلاقیں دے دی جائیں۔

تعزیری سزا میں مصلحت کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔

آج کے دور میں لوگ تین طلاقیں دینے سے باز

نہیں آتے بلکہ دے دیتے ہیں۔

ایک لطیف فائدہ یہ بھی ہے کہ تین طلاقوں میں

یہ اشارہ موجود ہے کہ رجوع نہ کرنا بہتر ہے،

کیونکہ یہ مردِ اور عورت ایک دوسرے کے لیے

مناسب جوڑ نہیں ہیں۔

طلاق کی نیت سے نکاح اور رجوع کرنا باطل ہے،

حتیٰ کہ رجوع کے ساتھ بھی یہ شرائط رکھی گئی

ہیں۔

ابتداء اسلام میں متعہ نکاح حلال تھا، لہٰذا ان

دنوں تین طلاقیں ایک ساتھ ممکن تھیں۔ ان دنوں

جان بوجھ کر حلالہ بھی ممکن تھا، لیکن لعنت کے

ساتھ۔

اب قیامت تک متعہ نکاح حرام ہے، لہٰذا جان بوجھ
کر حلالہ ممکن نہیں، کیونکہ طلاق کی نیت سے
نکاح نہیں ہوتا۔

بعض علماء متعہ نکاح اور طلاق کی نیت سے نکاح
میں فرق کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر طلاق کی
نیت کو مخفی رکھا جائے تو نکاح ہو جاتا ہے،
حالانکہ یہ دھوکہ ہے اور انسان کی زندگی تباہ ہو
سکتی ہے۔

جس مسلک میں طلاق کی نیت سے رجوع صحیح

ہے، وہاں تین طلاقیں ممکن ہیں، لیکن تین طلاقوں

کا اصل مقصد اسی صورت میں ختم ہو جاتا ہے۔

یہ اس لیے ہے کہ طلاق کے بعد عدت کے دنوں

میں سوچ و فکر کی جائے اور ایک دوسرے کے

احسانات واضح ہوں، تاکہ دوبارہ ایک ہونے کا ارادہ

اور نیت پختہ ہو، کیونکہ طلاق میں کئی زندگیاں

متاثر ہوتی ہیں۔ عدت کے دوران بہت سے فوائد

حاصل ہو سکتے ہیں، لیکن اہم فائدہ یہی ہے کہ
اس میں سوچ و فکر کی جا سکے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ حدیث کے مطابق نبی
ﷺ کے دور میں، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ
کے دور میں، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے
ابتدائی دو سال میں تین طلاقیں ایک ہی شمار
ہوتی تھیں۔ اسی حدیث کی بنیاد پر میں نے یہ
پوسٹ کرنے کی ہمت کی۔

طلاق کے معاملے کو مذاق میں لینا سنگین خطرہ ہے، کیونکہ اس سے کفر کا امکان بڑھ جاتا ہے، اور کفر کی صورت میں نکاح باطل ہوتا ہے۔ تاہم، تین طلاقوں میں یہ شمار نہیں ہوتا۔

واللہ تعالیٰ اعلم

- مرد اور عورت میں مساوات یا انصاف:

اس پوسٹ کے لیے ذہن میں یہ بات رکھیں کہ یہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے۔

فطرتی کمی سے انسان کی شان میں کمی واقع نہیں
ہوتی۔ عورت کی فطرتی عقل مرد کی نسبت کم ہے،
اور عورت اپنی اولاد سے مرد کے مقابلے میں زیادہ
جذباتی اور طبعی محبت کرتی ہے۔

گواہی دینے کے موقع پر اکثر کرپشن کی ترغیب ملتی
ہے۔ مرد اپنی اولاد کی محبت میں جھوٹی گواہی دینے
کی طرف میلان رکھتا ہے، اور عورت بھی اپنی اولاد
کی خاطر ایسا کر سکتی ہے، لیکن عورت کی طبعی

محبت زیادہ اور فطرتی عقل کم ہونے کی وجہ سے
امتحان سخت ہوتا ہے۔ اس لیے انصاف کے تقاضے کے
مطابق عورت کی گواہی کو دو عورتوں میں تقسیم
کیا گیا تاکہ وہ ایک دوسرے کی مدد سے جھوٹی
گواہی دینے سے باز آئیں۔ اللّٰہ نے انسان کی فطرت
اور اس نظام کی فطرت کو دیکھتے ہوئے قوانین
بنائے ہیں، اس لیے اسلام ایک فطرتی مذہب ہے۔

اسی طرح، اگر مرد اور عورت برابر عبادت کریں، تو
عورت کی فضیلت زیادہ ہوگی، کیونکہ عورت زیادہ

جذباتی اور محدود عقل کے ساتھ عبادت کرتی ہے۔

مرد کو بطور انصاف فضیلت حاصل کرنے کا حکم

دیا گیا ہے، جیسے کہ میاں بیوی جب جھگڑ رہے

ہوں تو مرد کو خاموشی اختیار کرنا چاہیے تاکہ عورت

پر فضیلت قائم ہو۔ یہ مرد پر ظلم نہیں ہے،

کیونکہ مرد کی فطرتی عقل نسبتاً زیادہ ہے۔

نان و نفَقہ مرد پر واجب ہے تاکہ اس نیکی سے

مرد فضیلت حاصل کر سکے، کیونکہ مرد کی عقل

زیادہ ہے۔ اگر عورت پر نان و نفَقہ لازم ہوتا، تو

عورت اپنی اولاد سے زیادہ طبعی محبت اور محدود عقل کی وجہ سے کرپشن کی طرف میلان رکھتی اور امتحان سخت ہو جاتا۔

مقصد یہ ہے کہ دنیا اور جمہوریت صرف مساوات کی رٹ لگاتے ہیں، جبکہ اللّٰہ کے قوانین رحمت اور انصاف کی بنیاد پر ہیں۔ ہر مساوات میں انصاف موجود نہیں ہوتا۔

واللہ تعالیٰ اعلم

ریفاین شدہ متن گرامر اور روانی کے ساتھ یوں ہو سکتا ہے:

شرافت اور فضیلت کا دارومدار

آیت:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ (49:13)

ترجمہ: "بے شک اللّٰہ کے نزدیک تم میں زیادہ

عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔"

اللّٰہ کی عبادت اور تابعداری کے نتیجے میں پرہیزگاری

حاصل ہوتی ہے (البقرہ: 21)۔ تقویٰ سے مراد عقلی

خوف و پرہیزگاری ہے، یعنی نیکوکاری۔ جتنی زیادہ

نیکیاں ہوں گی، اتنا ہی زیادہ تقویٰ دار سمجھا

جائے گا۔

مذکورہ آیت کے مطابق انسان کی شرافت اور عزت کا دارومدار عقلی تقویٰ یعنی نیکوکاری پر ہے۔ ہواؤں میں اڑنا شرافت نہیں ہے، بلکہ ہواؤں میں اڑنے کے باوجود اللّٰہ کی تابعداری اور نیکوکاری میں کمی نہ آنا شرافت ہے۔

حدیث:

مفہوم: "جس نیکی کا ذریعہ بنوگے، وہ تمہارے عمل نامہ میں بھی لکھی جاتی ہے۔"

صحابہ کرام:

قیامت تک دین اسلام پر جو عمل کیا جائے گا، وہ نیکیاں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے عمل نامہ میں بھی لکھی جائیں گی کیونکہ وہ اس کے ذریعہ بنے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرام کی کتنی نیکیاں ہیں، جو تصور سے باہر ہیں۔ چونکہ شرافت اور عزت نیکوکاری پر موقوف ہے، اس لیے اللّٰہ کے

نزدیک صحابہ کی شرافت اور عزت کا بھی اندازہ

لگایا جا سکتا ہے۔

قرآن میں ہے:

"بے شک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔"

انسان کی شان مغفور بن کر ہے۔ انبیاء علیہم السلام

کا معصوم ہونا ضرورت کی بنا پر ہے۔

صحابہ کرام مغفور ہیں، اور انہوں نے اتنی نیکیاں

کی ہیں کہ ان کے گناہ نیکیوں میں مٹا دیئے گئے

ہیں۔ صحابہ کے گناہ دین کی تکمیل کے لیے ہیں

تاکہ ہم سیکھیں کہ گناہ کے بعد کیا کرنا چاہیے، اور یہ کہ گناہ سے انسان کافر نہیں ہوتا۔ صحابہ کے گناہ صرف تعلیم کی نیت سے ذکر کیے جا سکتے ہیں، اور ذکر کرنے سے پہلے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ صحابہ کرام مغفور ہیں۔ قرآن میں جب صحابہ کی خطا ذکر کی گئی، تو ساتھ میں معافی کا اعلان بھی کیا گیا، جب خطا تعلیم کے ارادے سے ذکر کی گئی ہو۔

قرآن میں ہے: "صحابہ کرام کی طرح ایمان لے آئیں۔"

ایمان کا مفہوم ہے قرآن و حدیث کا علم۔ یعنی وہ علم اور تفسیر معتبر ہے جو صحابہ کرام نے کی، خاص طور پر اجماع صحابہ۔ کیونکہ جس سمجھ پر صحابہ متفق ہیں، وہ شریعت کا منشا سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے صحابہ کے اجماع کی مخالفت شریعت یعنی قرآن و حدیث کی مخالفت کے مترادف ہے۔

آخری نبی ﷺ:

صحابہ کرام اور قیامت تک تمام مسلمانوں کی

نیکیاں حضرت محمد ﷺ کے عمل نامہ میں بھی

لکھی جائیں گی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے

کہ نبی ﷺ کے کتنے نیکیاں ہیں، جو تصور سے

باہر ہیں۔ نبی ﷺ سب سے زیادہ نیکیاں رکھتے

ہیں، اس لیے مخلوقات میں اولین درجے پر ہیں اور

تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ شرافت اور عزت

والے ہیں۔

نبی ﷺ آسمانی دنیا کا سفر کرنے پر شرافت اور

عزت والے نہیں بنتے، بلکہ آسمانی دنیا کے باوجود

اللّٰہ کی تابعداری اور عبدیت میں کوئی فرق نہیں

آتا۔ یہ نبی ﷺ کی شان ہے۔ جیسے ہم اگر چاند

پر پہنچ جائیں یا کوئی عظیم نعمت حاصل کریں،

تو ہم اللّٰہ کو بھول جاتے ہیں۔ لیکن اللّٰہ جب نبی

ﷺ کے اسراء کا ذکر فرماتا ہے، تو لفظ "عبد"

استعمال کرتا ہے۔ اس سے تعلیم ملتی ہے کہ نبی

ﷺ عبد اور عاجز ہیں، اور آسمانی دنیا کے
باوجود اللہ کے تابعدار ہیں۔

نتیجہ:

انسان کی شرافت تقویٰ اور نیکوکاری پر ہے۔ نسب،
مال، حسن وغیرہ صرف آزمائش ہیں۔ نسب کا
فائدہ یہ ہے کہ جب کسی کی شرافت اور عقلی تقویٰ
معلوم کرنا ہو، تو یہ دیکھا جائے کہ جو گناہ وہاں
عام ہے، اس سے پرہیز کرتا ہے یا نہیں۔ مثال کے
طور پر، اگر کوئی پٹھان زنا سے محفوظ ہے، تو اس

سے شرافت اور عقلی تقویٰ ثابت نہیں ہوتی کیونکہ

وہاں زنا مشکل ہے۔ لیکن اگر مغربی ممالک میں

کوئی زنا سے محفوظ رہتا ہے، تو یہ شرافت اور

عقلی تقویٰ کی نشانی ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

ایمان بالغیب

ایمان بالغیب وہ حالت ہے جس میں انسان نہ اللّٰہ کو دیکھتا ہے، نہ جنت و جہنم کو، اور نہ دیگر غیبی حقائق کو دیکھا ہو، بلکہ صرف تصدیق کے ذریعے ایمان لاتا ہے۔

ایمان بالغیب جتنا کم ہوتا ہے، یعنی غیب سے پردہ جتنا زیادہ اٹھایا جاتا ہے، آزمائش اتنی ہی سخت

ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے انبیاء علیہم السلام پر

آزمائشیں سخت تھیں۔

مثال کے طور پر:

آدم علیہ السلام کا غیبی ایمان سے پردہ جزوی طور

پر اٹھ چکا تھا، اس لیے بھول سے میوہ کھانے پر

بطور انصاف سزا دی گئی۔

بنی اسرائیل کے وہ لوگ جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھے، ان کا بھی غیبی ایمان سے پردہ اٹھ چکا تھا، اس لیے انہیں سخت توبہ مقرر کی گئی۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہر مرتد کی سزا قتل ہے، بلکہ عدالت اور انصاف کے اصول کے تحت غیبی ایمان کی حالت کو دیکھا گیا۔

اسی طرح، موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر موجود بنی اسرائیل کا غیبی ایمان سے پردہ اٹھا ہوا

تھا، اس لیے اللّٰہ کی طرف سے زبردستی کے احکام

جاری کیے گئے اور اللّٰہ نے ان پر کوہ طور اٹھایا۔

اس میں اشارہ یہ ہے کہ جس پر غیبی ایمان سے

پردہ اٹھ جائے یا کم ہو جائے، اللّٰہ کی طرف سے

جھٹکے مل سکتے ہیں۔ خلیفہ کی طرف سے جھٹکے

نہیں ملتے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور

نہیں اٹھایا تھا۔

ایمان بالغیب یہ بھی ہے کہ صرف اللّٰہ کے فرمان

کی وجہ سے تصدیق کی جائے، مثلاً:

حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی، استقامت، اور
خدمت خلق میں یہ یقین کرنا کہ اس میں خیر
ہی خیر ہے، چاہے ظاہری نفع نظر نہ آ رہا ہو۔

مومن اللّٰہ پر مکمل اعتماد کرتا ہے کہ اگر اللّٰہ نے
فرمایا کہ خدمت خلق میں خیر ہے، تو یقینی طور
پر خیر ہے، چاہے پوری دنیا کے نقصان برداشت کرنے
پڑیں۔

نوٹ:

اللّٰہ کا صحیح حکم تلاش کرنے کے لیے اجتہاد اور تحقیق کرنا ایمان بالغیب کی روح کے منافی نہیں ہے، کیونکہ مخلوق کی باتوں پر اندھا اعتماد کرنا مناسب نہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

محکمات اور متشابہات

> وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝

ترجمہ: 51:56

"اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا
کیا ہے کہ میری عبادت کریں۔"

مقصد ہمیشہ اللہ کی عبادت ہے۔

قرآن میں محکمات اور متشابہات دونوں قسم کی معلومات موجود ہیں۔ ہماری عبادت کے مقصد کے لیے محکمات ہی ضروری اور فائدہ مند ہیں۔

مثال کے طور پر:

آدم علیہ السلام نے اعتراف جرم کیا، جس پر اللہ نے مہربانی فرمائی۔ یہ واقعہ ہماری مقصد کے لیے فائدہ مند ہے۔

جبکہ یہ کہ کون سا میوہ کھایا گیا تھا، یہ ہماری مقصد کے لیے فائدہ مند نہیں۔ اس میں فائدہ تلاش کرنا ٹیڑھے دل کی نشانی ہے۔

اگر متشابہات میں دنیا یا غیر مقصد کے لیے فائدہ
تلاش کرنا ہو تو یہ ٹھیک ہے، کیونکہ ایجادات میں
یہی کرنا پڑتا ہے۔

حروف مقطعات (الم وغیرہ) متشابہات کی مثال ہیں۔
ان کی بار بار تلاوت کرنے سے انسان مظہر پرستی
سے بچتا ہے اور سمجھتا ہے کہ:
"اے انسان! تمہاری مثال کنویں کے مینڈک کی
طرح ہے، جو دنیا کو صرف اتنا ہی سمجھتا ہے جتنا
کنواں ہے۔ لیکن اللہ کے پاس معلومات کی اتنی

کثرت ہے کہ سات سمندر سیاہی بن جائیں اور
درخت قلم بن کر لکھتے رہیں، سیاہی اور قلم ختم
ہو جائیں، مگر علم ختم نہیں ہوگا۔"

اس لیے جب اللہ کسی علم کی خبر دے، تو اللہ پر
بھروسہ کر کے تصدیق کریں۔

محکمات مقصد کے لیے فائدہ مند ہیں، اس علم کی
طلب کریں۔

متشابہات پر اجمالی ایمان لائیں۔

مثال کے طور پر:

ذائقے دار خوراک، خوبصورت اور نیک سیرت پارٹنر،

حسین جگہیں ہماری عقل میں بڑی نعمتیں ہیں،

اسی لیے جنت کو اکثر اس طرح بیان کیا جاتا ہے

تاکہ انسان اس کی طرف رغبت کرے، اور یہ

ہماری مقصد کے لیے فائدہ مند ہے۔ حقیقت میں

جنت کی تقدیر اتنی عظیم ہے کہ انسان نے اس کا تصور بھی نہیں کیا۔

اسی طرح، عذاب قبر یا عام عذاب محکمات میں شامل ہیں، کیونکہ ان سے بچنے کے طریقے سیکھنا مقصد کے لیے ضروری ہے۔ ان عذاب کی اکثر کیفیات متشابہات میں سے ہیں، کیونکہ اللہ کے پاس تکلیف دینے کے لامحدود آپشنز موجود ہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

دنیا کو دیکھنے کا نقطہ نظر

> وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۞

ترجمہ: 51:56

"اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا

کیا ہے کہ میری عبادت کریں۔"

یہ آیت دنیا کو دیکھنے کا صحیح نقطہ نظر بیان

کرتی ہے۔

جب نقطہ نظر غلط ہو تو اللہ کے قوانین بھی غیر

مناسب لگ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

اگر نقطہ نظر یہ ہو کہ "یہ دنیا صرف چار دن کی زندگی ہے، اس لیے خوب انجوائے کرو"، تو اس کے مطابق عورت پر پردہ کرنا ظلم لگے گا، کیونکہ عورت کو بھی لطف اندوز ہونے کا حق ہے۔

اسی لیے قرآن کریم اس دنیا کو دیکھنے کا صحیح انداز اختیار کرنے پر زور دیتا ہے۔

یہ ہماری مشترکہ ذمہ داری ہے کہ ہم انسانوں کا دنیا کو دیکھنے کا زاویہ اس آیت کے مطابق بنائیں،

کیونکہ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللہ" کو حاکمیت کے درجے تک پہنچانے کے لیے یہی نقطہ نظر ضروری ہے۔ اور یہ حاکمیت ہماری مشترکہ ذمہ داری ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

—

اسلام کے دو حصے ہیں:

1. لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ (توحید)

2. لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے اظہار کا طریقہ کار

1) توحید:

توحید میں صرف تقلید پر اکتفا نہ کریں۔ مثلاً
صرف یہ نہ سیکھیں کہ "علماء کہتے ہیں اللّٰہ ایک
ہے" یا عبادت پر رٹا لگائیں۔ بلکہ اس طرح

سیکھیں کہ دہریہ اور مشرک کو بھی سمجھا
سکیں، کیونکہ توحید عقلی دلائل سے سیکھا جا
سکتا ہے اور عقل سلیم اسے سمجھ سکتی ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایمانیات
(عقائد) میں تقلید معتبر نہیں۔ جمہور اہل علم کے
نزدیک تقلید معتبر ہے، لیکن پھر بھی سیکھنے اور
تحقیق کرنے کی طلب ضروری ہے۔

2) توحید کے اظہار کا طریقہ کار:

رسولوں پر توحید کے اظہار کا طریقہ کار نازل کیا جاتا تھا، اور قیامت تک قرآن و حدیث اس کا ذریعہ ہیں۔ قرآن و حدیث کے علاوہ کوئی طریقہ اللّٰہ کو منظور نہیں ہے۔

اس میں عقل کا استعمال محض تحقیقی تقلید تک محدود رہتا ہے، مثلاً یہ سمجھنے کی ضرورت نہیں کہ ایک رکعت میں دو سجدے کیوں ہیں، تین کیوں نہیں، کیونکہ یہ اللہ کی مرضی ہے۔ اللہ حکمت والا اور خبردار ہے۔

البتہ اجتہاد کے لیے علت تلاش کرنا ضروری ہوتا ہے۔

اور تقلید میں تحقیق ضروری ہے تاکہ بدعات میں مبتلا نہ ہوں۔

نوٹ:

دین میں عقل کا استعمال مطلقاً مذموم نہیں۔

اللہ کے حکمِ میں انکار کی نیت سے عقل لڑانا مذموم ہے، جیسے شیطان نے کیا۔

اللہ کا صحیح حکم تلاش کرنے کے لیے اجتہاد کرنا
قابل تعریف ہے تاکہ بدعات سے بچا جا سکے۔

توحید میں عقل کا استعمال ضروری ہے تاکہ شکوک
و شبہات سے بچا جا سکے۔ یہ توحید آپ کو عمل
کی طرف مائل کرے گی۔ کیونکہ جب انسان شرک
کے معاملے میں سنجیدہ ہوتا ہے، تو وہ بہت سے
شکوک و شبہات میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

عبادت انسان کی فطرت ہے اور مومن کے دلوں کو اطمینان پہنچاتی ہے

اسلامی نظریات کو دل سے تسلیم کرنے والا انسان مومن کہلاتا ہے، اور یہ نظریات مومن کو ایک ایسی کیفیت میں ڈالتے ہیں جسے برداشت کرنا بعض

اوقات بہت مشکل ہوتا ہے۔ اگر یہ نظریات پہاڑوں

پر رکھ دیے جائیں تو وہ ذرہ ذرہ ہو جائیں گے۔

ان نظریات کو برداشت کرنے اور ان پر صبر کرنے

کا واحد قانونی اور حلال طریقہ یہ ہے کہ اللّٰہ کی

عبادت کو مقصد بنایا جائے۔

اللّٰہ کی عبادت انسان کی فطرت ہے کیونکہ جن و

انس کی پیدائش کا بنیادی مقصد ہی یہی ہے۔

فطرت کے خلاف زندگی گزارنا مشکل ہوتا ہے، اس

لیے عبادت دل و جان کی سکونت اور اطمینان کا

ذریعہ ہے۔

ہر عمل میں عبادت کی نیت کریں، چاہے وہ:

کھانا پینا ہو

دوکانداری یا کاروبار ہو

مہمان نوازی ہو

تکالیف سہنا ہو

یہ سب کچھ عبادت کے ساتھ کیا جائے اور اللّٰہ سے
اجر کی امید رکھی جائے۔ ورنہ وسائل زیادہ ہونے
کے باوجود بھی دل تنگ محسوس کرے گا۔

یہ تنگی کا احساس خاص طور پر اس وقت ہوتا ہے
جب نشہ یا دیگر عارضی راحتوں سے پرہیز کیا
جائے، کیونکہ نشے سے انسان وقتی ریلیکس محسوس

کرتا ہے، لیکن یہ ریلیکس غیر قانونی اور غیر
مستحکم ہے۔ عبادت کے ذریعے حاصل ہونے والا
اطمینان بابرکت (لازوال اجر کا باعث) اور دائمی
ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

آسمانی علم کی فضیلت

ہر غلطی اور گناہ کے پیچھے بنیادی وجہ جہالت ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر:

بوڑھے ماں باپ کو نظر انداز کرنے میں بیٹے کا قصور خود غرضی یا مطلبی پن نہیں، بلکہ جہالت ہے۔ یہ جہالت اس وجہ سے ہے کہ اسے لگتا ہے کہ نعمتیں جائیداد اور کرنسی سے حاصل ہوتی ہیں، یا

وہ آخرت کو تسلیم نہیں کرتا، یا سمجھتا ہے کہ

آخرت ہے لیکن ویسے بھی وہ جنتی ہوں گے۔

جب اللّٰہ نے فرشتوں سے فرمایا کہ وہ انسان کو

پیدا کرنے والا ہے، تو فرشتوں کو انسان کی فطرت

دکھائی گئی۔ انہوں نے انسان میں خود غرضی اور

مطلبی پن کو دیکھا اور یہ نتیجہ نکالا کہ انسان

ایک دوسرے کے خون بہائے گا۔ تب اللّٰہ نے علم

کا نمونہ پیش کیا، جس میں اشارہ تھا کہ اگر

انسان اس آسمانی علم کو حاصل کرے تو یہی
فطرت انسان کے فائدے میں بدل جائے گی۔
(واللہ تعالیٰ اعلم)

یہ کہنا مناسب نہیں کہ "علم شیطان کے پاس بھی
تھا"، کیونکہ اس سے آسمانی علم کی حقارت ظاہر
ہو جاتی ہے۔ شیطان کے پاس علم تھا، لیکن وہ
ناقص تھا۔ اگر شیطان واقعی اللّٰہ کو حکمت والا
سمجھتا، تو وہ اللّٰہ کے حکم پر اعتراض نہ کرتا۔

جب کسی پیغمبر کو لوگوں نے اذیت پہنچائی، تو پیغمبر نے دعا کی کہ "یا اللّٰہ، ان کو بخش دے یہ نا سمجھ ہیں"۔ پیغمبر نے ان کا عذر پیش کیا کہ ناسمجھ ہیں اگر وہ سمجھتے، تو کیونکر یہ کرتے؟

واللہ تعالیٰ اعلم

توبہ سے ناامیدی کا نقصان

حدیث میں ہے مفہوم:

ایک شخص نے 99 قتل کیے تھے۔ پھر اس نے
توبہ کرنے کا ارادہ کیا اور ایک عابد (عبادت
گزار/غیر عالم) سے پوچھا کہ کیا میری توبہ قبول
ہو سکتی ہے۔ عابد نے کہا: "نہیں۔"

اس کے بعد اس نے سوچا کہ کیوں نہ 100 قتل پورے کر لوں، کیونکہ ویسے بھی اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔

توبہ سے ناامیدی کا نقصان یہ ہوا کہ اس نے اس عابد کو بھی قتل کر دیا۔

توبہ کی قبولیت کی امید انسان کو نیکی کی طرف مائل کرتی ہے۔

پھر اس نے ایک عالم سے پوچھا، تو عالم نے کہا:

"ہاں، تمھاری توبہ قبول ہوگی۔" عالم نے مزید کہا

کہ اپنا ماحول بدل دو۔ جب وہ شخص اپنا ماحول

بدلنے نکلا، تو راستے میں ہی موت آ گئی۔ اللّٰہ نے

اسے بخش دیا۔

فطرت کے مطابق زندگی:

ہم نے ماضی میں بہت سے گناہ کیے ہوتے ہیں اور

آئندہ بھی کریں گے کیونکہ ہم فرشتے نہیں ہیں اور

نہ ہی نیکیوں سے تمام گناہوں کو مٹا سکتے ہیں۔

فطرتی زندگی یہ ہے کہ ماضی اور مستقبل کے گناہوں کو مٹانے کے لیے اپنی استطاعت کے مطابق نیک اعمال کرتے رہنا چاہیے، خاص طور پر وہ اعمال جو مرنے کے بعد بھی جاری رہیں۔

ماضی کے گناہوں کو مٹانے کے لیے نیکی کرنا خشوع کہلاتا ہے۔

مستقبل کے گناہوں کو مٹانے کے لیے نیکی کرنا

تقویٰ کہلاتا ہے، خاص طور پر جب خشوع اور تقویٰ

ایک ساتھ ہوں۔

عام طور پر تقویٰ سے مراد عقلی تقویٰ یعنی

نیکوکاری ہے۔

نماز میں بھی یہی نیت کرنا کہ ماضی کے گناہ

مٹ جائیں، اسے نماز میں خشوع کہا جاتا ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

وحی کے دو مطالبے ہوتے ہیں:

1. گناہ بالکل ترک کر دینا، جسے نصیحت پکڑنا کہتے ہیں۔

2. گناہ کے بعد نیکی کر کے اپنے گناہ کو مٹانا، جسے خشوع کہتے ہیں۔

القرآن میں ارشاد ہے:

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۞

ترجمہ: "اور اس سے نرمی سے بات کرو تاکہ شاید وہ نصیحت پکڑ لے یا ڈر جائے" (طه: 44)

جو خشوع اور تقویٰ پر موصوف ہوا، وہ کامل کامیاب ہوا۔

واللہ تعالیٰ اعلم

دلائل

دلائل تین قسم کے ہوتے ہیں:

1. عقلی دلیل

2. دلیل ہدیٰ (قرآن و حدیث)

3. دلیل بدیہی (جیسے دو جمع دو چار وغیرہ)

عقلی دلیل کے ذریعے خالق اور اس کی کتاب کی حقانیت واضح ہوتی ہے ۔

البتہ، اللہ کے احکامات معلوم کرنے کے لیے دلیل ہدیٰ اور دلیل بدیہی کا استعمال کیا جاتا ہے، جس میں دلیل ہدیٰ غالب ہے۔

اگر قرآن و حدیث میں کسی چیز سے منع کیا گیا ہے، اور دلیل بدیہی کے مطابق اس میں اثر بھی پایا جاتا ہے، اور ظاہری فائدہ بھی نظر آتا ہے، تب بھی وہ چیز ممنوع ہے، جیسے جادو، شراب وغیرہ۔

اگر قرآن و حدیث میں منع نہیں ہے اور دلیل
بدیہی سے ثابت ہے کہ کسی چیز میں اثر ہے، تو
اس چیز کے سبب اللّٰہ کی مدد طلب کی جا سکتی
ہے۔

اور اگر قرآن و حدیث میں منع نہیں ہے، لیکن
دلیل بدیہی سے بھی ثابت نہیں ہے، تو اس چیز کے
سبب اللّٰہ کی مدد طلب نہیں کی جائے گی، البتہ
تجربہ کر سکتے ہیں ۔

مثال کے طور پر:

ہزار سال پہلے، مشرق میں بیٹھے ہوئے شخص سے یہ پوچھنا کہ مجھے مغرب کے فلاں ملک کی موجودہ صورتحال بتاؤ، شرک تصور کیا جاتا تھا، کیونکہ اس زمانے میں ظاہری اسباب موجود نہیں تھے اور مافوق الاسباب تصرف کا وہم ہوتا تھا۔ نہ دلیل بدیہی تھی، نہ قرآن و حدیث میں ایسی اجازت دی گئی تھی۔

آج کے دور میں، مشرق میں بیٹھے ہوئے شخص سے

یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ مغربی ممالک کے حالات

بتاؤ، کیونکہ آج ظاہری اسباب (انٹرنیٹ وغیرہ)

موجود ہیں۔ لہٰذا یہ شخص اللّٰہ کی مدد سے مغرب

کا حال بتا سکتا ہے، اور اس کے سبب اللّٰہ کی مدد

طلب کی جا سکتی ہے۔

خلاصہ:

عمل کرتے وقت تمہارے پاس جواز کی کوئی دلیل

ہونا ضروری ہے۔

مثلاً، اگر کوئی کام قرآن و حدیث اور دلیل بدیہی
سے ثابت بھی ہو، لیکن تمہیں معلوم نہ ہو، تو بہتر
ہے کہ اس سے اجتناب کریں تاکہ شرک سے بچا جا
سکے۔

البتہ، اگر تجربہ کرنا چاہو تو کر سکتے ہو، کیونکہ
اللّٰہ نے سب کچھ ہمارے تابع کیا ہے۔ اس کو
تلاش کرنے کی نیت سے تجربات کرنا جائز ہے،
بشرطیکہ قرآن و حدیث میں اس پر منع نہ ہو۔

واللہ تعالیٰ اعلم

اللّٰہ کو پانا

ایک سوال ذہن میں آتا ہے: 60 سال کی زندگی کے بدلے ہمیشہ کی جنت یا جہنم کیوں دی جاتی ہے؟

جواب:

1. اللّٰہ کو پانا یا کھونا معمولی بات نہیں ہے۔

مومن اللّٰہ کو پاتا ہے، جس سے مومن کے اعمال پر

اللّٰہ کی صفات غفور اور شکور کی برکت ملتی ہے۔

غفور سے گناہ مٹ جاتے ہیں، چاہے سزا کے بعد

ہوں یا بغیر سزا کے۔

شکور سے مومن کی نیکیوں کا بدلہ لازوال ہو جاتا

ہے۔

جبکہ کافر اللہ کو کھو دیتا ہے، جس کی وجہ سے

وہ غفور اور شکور سے محروم ہو جاتا ہے۔

گناہوں کی سزا پا کر بھی وہ مٹ نہیں جاتے،

کیونکہ صرف اللہ ہی گناہ مٹا سکتا ہے، چاہے سزا

کے بعد یا بغیر۔

نیکیوں کا بدلہ فانی ہو جاتا ہے، یعنی دنیا میں ہی
ختم ہو جاتا ہے۔

2. عادت کی سزا دی جاتی ہے۔

مثال کے طور پر، اگر کافر نے 60 سال میں عادةً
ظلم کیا، تو اگر یہ ہمیشہ زندہ رہتا، تو ہمیشہ
یہی کفر اور ظلم کرتا رہتا۔

جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے :

وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۞

ترجمہ:

اور اگر (بالفرض) ان کو واپس بھیج بھی دیا جائے تو بھی انہوں نے یقیناً پھر وہی کچھ کرنا ہے جس سے ان کو منع کیا گیا تھا اور یہ پرلے درجے کے جھوٹے ہیں،

(الانعام - 28)

نتیجہ:

ہماری دنیاوی زندگی اور اعمال کا دارومدار اللّٰہ کی رضا، ہمارے اعتقاد اور عمل، اور عادت پر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ 60 سال کی زندگی کے بدلے ہمیشہ کا فیصلہ دیا جاتا ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

تعصب

تعصب ضد و عناد کی ایک اہم وجہ ہے، چاہے وہ قومیت و نسل پر مبنی ہو یا مذہب پر۔ اس کا سب سے بڑا نقصان حق سے محروم ہونا ہے۔

تعصب کا ایک باریک نقصان یہ بھی ہے کہ اگر دوسرا مسلک یا مذہب کا شخص ناحق پر ہو، تو متعصب شخص اس کی مخالفت کرتا ہے، لیکن حق کی بنیاد پر نہیں بلکہ صرف اپنے تعصب کی وجہ سے۔ وہ دلیل پیش کرتا ہے جو اکثر غیر مناسب ہوتی ہے، اور جب مخالف شخص اس دلیل کو کمزور کر دیتا ہے تو ناحق پر موجود شخص مزید مضبوط ہو جاتا ہے۔

مثلاً:

عالمِ الغیب کی نفی بعض اوقات مخلوق سے اس طرح کی جاتی ہے کہ اس کے دلائل غیر مناسب اور ناقص ہوتے ہیں۔ یہ دلائل مخلوق کے سامنے پیش کرنے سے مزید اشکالات پیدا ہوتے ہیں اور مخالف شخص اپنی دلیلوں کے ذریعے مضبوط ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہود و نصاریٰ وغیرہ کے رد بھی اکثر مناسب دلائل کے بغیر ہوتا ہے، جس کی وجہ سے فساد مزید بڑھ جاتا ہے۔

نوٹ:

ایمان کی دو قسمیں ہیں:

1. ظاہری ایمان: یہ احکامات کے اطلاق کے لیے ہے۔ ہمیں ظاہر نظر آتا ہے کہ کون مومن ہے۔ مثلاً زکوٰۃ ادا کرنے میں ظاہری ایمان دیکھا جاتا ہے کیونکہ کافر کی مالی مدد زکوٰۃ کے علاوہ مال میں کی جاتی ہے۔ نماز میں بھی ظاہری ایمان کا فرق دیکھا جاتا ہے۔

2. حقیقی ایمان: یہ اللہ کے نزدیک مومن ہونے کی شرط ہے اور جنت کا ذریعہ بنتا ہے۔ حقیقی ایمان میں ضد و عناد سے پرہیز کرنا شامل ہے۔

ضد و عناد کی وجوہات میں تکبر، حسد، تعصب، آب و جد، اور شخصیت پرستی شامل ہیں۔

حکمت عملی:

جس مسئلے میں اللہ آپ کو واضح علم عطا کرے،

وہاں تقلید ترک کریں اور علم کو تسلیم کریں۔

جس مسئلے میں سمجھ نہ آئے، اہل علم سے

پوچھیں اور تقلید کریں۔

عوام کے لیے شخصی تقلید مناسب ہے کیونکہ عوام

ائمہ کرام اور فقہاء کے مسائل میں راجح و مرجوح

نہیں جانتے۔ اس صورت میں خواہش کی بنیاد پر

آسانی تلاش کرتے ہیں، جبکہ اصل مقصد راجح و

مرجوح میں اللہ کا حکم تلاش کرنا ہے۔

ائمہ کرام کی بنیادی اصطلاحات اور تعریفیں مختلف ہوتی ہیں، اور قوانین بھی انہی اصطلاحات کے مطابق ہوتے ہیں۔ اگر بنیادی اصطلاحات کو بدل دیا جائے تو قوانین غیر متوازن ہو جاتے ہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

دعا مانگنے کے دو طریقے

1. اسمائے حسنیٰ کو وسیلہ کے طور پر پیش کرنا:

مثلاً:

یا اللّٰہ، یا رحمٰن، یا رب، یا رب العالمین، یا رب محمد ﷺ، ربنا وغیرہ۔

(اعراف: 180)

2. نیک اعمال کو وسیلہ کے طور پر پیش کرنا:

مثلاً:

ایمان (ایمان کو وسیلہ بنا کر مغفرت طلب کریں)،

نماز، روزہ، خدمت خلق، درود شریف وغیرہ۔

(صحیح البخاری: حدیث نمبر 5974، صحیح مسلم:

حدیث نمبر 2743)

نیک اعمال کا دائرہ وسیع ہے۔ جو اعمال قرآن و

حدیث سے ثابت ہوں، وہ نیک اعمال کہلاتے ہیں۔

کسی زندہ شخص کو دعا کے لیے کہنا بھی نیکی ہے۔

کسی کو دعا کرنا بھی نیکی ہے۔ مسلمانوں کو دعا
کرکے اس نیکی کو وسیلہ بنا کر حاجت طلب کرنا
جائز ہے۔

کسی سے اللہ کے لیے محبت یا نفرت کرنا بھی نیکی
میں شمار ہوتا ہے، اور اسے وسیلہ بنا کر حاجت
طلب کی جا سکتی ہے۔

اس میں بعض اہل علم اللّٰہ کے لئے محبت کو

حرمت سے تعبیر کرتے ہیں یا واسطہ سے مثلاً

محمد ﷺ کے حرمت کو وسیلہ میں پیش کرکے

اللّٰہ سے حاجت طلب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ میرا

نبی کریم ﷺ سے صرف اللّٰہ کے لئے محبت ہے

میں اس نیکی (اللّٰہ کے لئے محبت) کو وسیلہ میں

پیش کرتا ہوں --

با حرمت فلاں یا فلاں کے واسطے سے بہتر یہ ہے

کہ یوں کہا جائے کہ میرا اس سے اللّٰہ کے لئے

محبت ہے اس کو وسیلہ میں پیش کرتا ہوں ---

واللہ تعالیٰ اعلم

نوجوان نسل کے نام ایک پیغام

اللہ تعالیٰ انسان کو آزمائش کے طور پر مال عطا
کرتا ہے اور اس مال میں مختلف فرائض مقرر
فرمائے ہیں، مثلاً: خود پر، والدین پر، بیوی اور
بچوں پر، صلہ رحمی پر، پڑوسیوں پر اپنی استطاعت
کے مطابق خرچ کرنا۔ مالداری میں مالداری کے
مطابق، اور غربت میں غربت کے مطابق۔ یہ اصول

صرف مال تک محدود نہیں بلکہ ذات پر بھی لاگو ہوتا ہے۔

انسان اپنی اولاد یا اپنوں پر کروڑوں خرچ کر سکتا ہے لیکن غیروں یا جنہیں انسان غیر سمجھتا ہے ان پر چند روپے خرچ کرنا بڑا محسوس ہوتا ہے۔ یہ تقریباً انسان کی فطرت ہے۔

عورتوں کی اکثریت اپنے شوہر کے رشتے داروں کو اپنا نہیں سمجھتی، اس لیے شوہر کے ان پر خرچ کو

بوجھ محسوس کرتی ہیں۔ عورت کا قصور محض یہ

ہے کہ وہ اپنے شوہر کے رشتے داروں کو اپنا نہیں

مانتی، اصل قصور شوہر کا ہے کہ وہ اپنے مال میں

اللہ کے مقرر کردہ فرائض کو نظرانداز کر کے اپنی

بیوی کے ذہن میں یہ تاثر ڈال دیتا ہے کہ: "میرا

سارا خزانہ صرف تمہارا ہے، ماں باپ وغیرہ بھاڑ

میں جائیں، میں ہی اکیلا تمہارا ہوں۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیوی غیروں پر خرچ

کرنا بوجھ محسوس کرتی ہے اور اپنی فطرت کے

مطابق شوہر کے خزانے کو اپنا سمجھ کر صرف

اپنوں پر خرچ کرنا چاہتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ بیوی کے ذہن میں یہ بات واضح

کر دی جائے کہ: "میرا مال و دولت صرف تمہاری

نہیں ہے، اللہ نے اس میں حصے مقرر فرمائے ہیں۔"

جب شوہر مستحقین پر خرچ کرے گا تو بیوی کو

اعتراض نہیں ہوگا اور وہ خفیہ تدابیر اختیار بھی

نہیں کرے گی۔ اس طرح چھوٹی موٹی لڑائیاں ہو

سکتی ہیں لیکن ان کی شدت کم ہو جائے گی،

کیونکہ اکثر لڑائیوں کا اصل سبب یہی ہوتا ہے کہ

شوہر کا مال کس طرح غیروں پر خرچ ہوتا ہے، جو

فطرت کی وجہ سے برداشت نہیں ہوتا۔

نوٹ: مال میں اللہ نے فرائض مقرر فرمائے ہیں،

لوفری نہیں۔ عیاشی پر اعتراض جائز ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

اصحابِ سبت:

داؤد علیہ السلام کے دور میں بنی اسرائیل پر ہفتے کے دن اللہ تعالیٰ نے مچھلیوں کا شکار ممنوع قرار دیا۔ ہفتے کے دن مچھلیاں بطور آزمائش زیادہ ہوتی تھیں، تو لوگ ہفتہ کے دن مچھلی کی دم میں ڈور باندھ کر سمندر میں چھوڑتے اور اتوار کے دن

پکڑتے تھے۔ اللہ نے ان کو اس عمل پر رسوا کر

کے ہلاک کیا۔

ان لوگوں نے گناہ کو گناہ نہیں سمجھا، یعنی

پکڑنے کو نہ پکڑنا کہا۔ اس میں ایک اہم بات

یہ ہے کہ انہوں نے حرام کو حلال کرنے کے لیے

حیلہ سازی کی۔ اس کا نقصان یہ ہے کہ یہ تحریف

کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے۔ جو شخص حیلہ سازی

کے ذریعے گناہ کو جائز بنا لیتا ہے، نصیحت کے

قبول کرنے کا امکان کم ہوتا ہے کیونکہ اس نے اپنے

لیے حلال کا دلیل بنا لیا ہے۔ جبکہ وہ شخص جو جہالت کی وجہ سے حرام کو حلال سمجھتا ہے، نسبتاً زیادہ امکان ہے کہ نصیحت قبول کرے گا۔

اسی لیے میں ایسی پوسٹس اس طرح نہیں کرتا کہ: "زنا گناہ ہے"۔ کیونکہ یہ سب کو معلوم ہے۔ میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ ان گناہوں اور شرک سے آگاہ ہوں جن سے عوام ناواقف ہیں، تاکہ وہ گناہ کو گناہ سمجھ کر کریں۔ گناہ کا اعتراف کرنے سے اللہ تعالیٰ توبہ کا راستہ آسان بنا دیتا ہے۔

یہ پوسٹس مجھ پر بھی لاگو ہوتی ہیں، لیکن پھر بھی کرنا ضروری ہے کیونکہ تبلیغ کے اصول کے مطابق حق بیان کرنا چاہیے، چاہے وہ خود کے خلاف ہو، مگر ہمیشہ تہذیب یافتہ الفاظ میں، بغیر کسی کا نام لیے، اور عام مخاطب کے لیے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

- میٹھا میٹھا ہم اور کڑوا کڑوا تم:

قرآن میں زجر والی آیت سن کر ایک شخص کہنے
لگے کہ یہ آیت بنی اسرائیل کے بارے میں ہے۔ تو
حضرت حذیفہ رض نے فرمایا کہ
اچھا بھائی ڈھونڈا ہے اپنے لئے کہ کڑوا آیت ہو تو
یہودیوں کے لئے ہیں اور میٹھا آیت ہو تو ہمارے
لئے ہیں ۔

واللہ تعالیٰ اعلم

ریفاین شدہ متن (صرف گرامر اور روانی درست کی گئی ہے):

کام، عبادت اور زندگی کا مقصد

یہ مطالبہ اللّٰہ کی طرف سے ہے۔

اگر کام نہ کریں اور صرف خوشیاں اور تفریح
کریں، تو یہ موقع اس کو ملتا ہے جس کا آخرت
میں حصہ نہیں۔
جس کا آخرت میں حصہ ہو اور وہ کوئی کام
(خدمت یا فرائض) نہ کرے تو اللّٰہ اسے بیماریوں

میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہ بیماری بھی ایک طرح کا کام ہے۔

یہ سوچنا کہ "پیسے کماؤں گا، اولاد کو نوکری دلاؤں گا اور خود لطف اٹھاؤں گا" ایک ناقص سوچ ہے۔

جب تمہیں کمانے کی ضرورت نہ پڑے تو دین کے کسی شعبے کی خدمت میں لگ جاؤ، ورنہ بیماریوں میں مبتلا ہو جاؤ گے، بشرطیکہ آخرت میں حصہ ہو۔

یہ قانون مرد اور عورت دونوں کے لیے ہے۔

جن دنوں بنی اسرائیل کو مفت میں من و سلویٰ ملتا تھا، اللّٰہ نے دن میں ان پر پچاس نمازیں فرض کی تھیں: عبادت، عبادت، عبادت اور بس عبادت۔

کمانا، پکانا، کام، خدمت خلق وغیرہ بھی عبادت ہے۔

کام کو دنیاوی مقاصد تک محدود نہ کریں، بلکہ اللّٰہ کے فرائض ادا کرنے کی نیت سے کریں۔

اپنی اولاد کو دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی نظریات بھی سکھائیں، کیونکہ دین کی خدمت اور سر بلندی اصل عبادت اور زمہ داری ہے۔ قرآن میں انسان کو خلیفہ کہا گیا ہے، یعنی زمین پر اللّٰہ کی تشریعی بادشاہت قائم کرنا۔ تمام عالم پر تو تکوینی بادشاہت اللّٰہ کی ہے، لیکن زمین پر تشریعی بادشاہت انسان کے حوالے کی گئی ہے، اسی لیے اسے خلیفہ کہا گیا ہے۔

اللّٰہ کو پانے کے لیے تکالیف اٹھائیں۔

آیات:

يَاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِۚ ۝

ترجمہ (84:6):

اے انسان! تو اپنے پروردگار کی طرف پہنچنے میں

خوب کوشش کرتا ہے، سو اس سے جا ملے گا۔

وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَىۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ

الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ‌ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيۡنَۙ ۞

ترجمہ (2:155):

اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال و جان

و میووں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے۔

تو صبر کرنے والوں کو بشارت سنادو۔

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ

جَاهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَيَعۡلَمَ الصّٰبِرِيۡنَ ۞

ترجمہ (3:142):

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ بغیر آزمائش بہشت میں

جا داخل ہو گے؟ حالانکہ خدا نے تم میں سے جہاد

کرنے والوں اور ثابت قدم رہنے والوں کو اچھی طرح

معلوم کیا ہی نہیں۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَھُمۡ لَا

یُفۡتَنُوۡنَ ۞

وَلَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ

صَدَقُوۡا وَلَیَعۡلَمَنَّ الۡکٰذِبِیۡنَ ۞

ترجمہ (29:2-3):

کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف یہ کہ ہم

ایمان لے آئے، چھوڑ دئیے جائیں گے اور ان کی

آزمائش نہیں کی جائے گی؟

اور جو لوگ ان سے پہلے ہوچکے ہیں، ہم نے انہیں

بھی آزمایا تھا، تاکہ خدا معلوم کرے کہ کون سچا

ہے اور کون جھوٹا۔

واللہ تعالیٰ اعلم

صلہ رحمی

اگر کوئی تمہیں حق دے اور تم بھی بدلے میں حق دو، اور وہ جب حق نہ دے تو تم بھی نہ دو، تو نبی کریم ﷺ نے اسے انتقامی زندگی کہا ہے۔

لیکن اگر رشتے دار تمہیں حق نہ دیں، پھر بھی تم
انہیں ان کا حق دیتے ہو، تو یہ صلہ رحمی کہلاتا
ہے۔

حدیث میں مفہوم ہے: صلہ رحمی قطع کرنے والا
جنت میں نہ جائے گا۔

حدیث میں مفہوم ہے: اللّٰہ فرماتا ہے جو صلہ رحمی
کرتا ہے، میں ان کے ساتھ رحم کروں گا، اور جو
قطع کرے، میری رحمت بھی اس سے قطع ہوگی۔

حدیث میں مفہوم ہے: صلہ رحمی سے مال اور عمر

میں برکت ہوتی ہے اور یہ اللّٰہ کی رضا کا باعث

بنتا ہے۔

طریقہ کار:

جب آپ ارب پتی ہیں اور رشتے دار ضرورت مند

اور صحت مند ہے اور کام نہیں کرتا، تو بغیر

خدمت کے مال نہ دیں، کیونکہ اس سے کرنسی کا

مقصد ضائع ہو جاتا ہے۔

مثلاً پودوں کو پانی دے کر بدلے میں ماہانہ تنخواہ

مقرر کریں۔ اس طرح معاشرے کو خیر بھی پہنچے

گا اور رشتے دار بھیکاری نہیں بنیں گے۔

کرنسی کا مقصد صرف زکوٰۃ میں بظاہر ضائع ہو

سکتا ہے۔

زکوٰۃ، قرض، اور بھیک صرف مجبوری کی حالت

میں دی جائے۔

درس و تدریس کرنے والا عالم، عورت، بچے، بوڑھے

ماں باپ، معذور، اور کوشش کے باوجود ضرورت

مند بھی اس میں شامل ہیں بشرطیکہ وہ غریب

ہوں۔

مثلاً اگر درس و تدریس کرنے والے عالم کا اپنا

کاروبار ہو اور ضروریات پوری ہوں، تو مال لینے سے

پرہیز کریں یا بدلے میں خدمت فراہم کریں۔ درس

و تدریس سے جو ماہانہ وظیفہ ملتا ہے، وہ بھی

صرف ضرورت کے مطابق لیا جائے۔

معذوری بھی کام کا حصہ ہے، اور اسی کام سے رزق برسا جاتا ہے۔ معذوروں کے لیے قومی خزانے سے بقدر ضرورت ماہانہ وظیفہ حق ہے۔

بیوی اور والدین میں متوازن رشتے داری:

قاعدہ: فرض کے لیے نوافل ترک کیے جا سکتے ہیں، لیکن نوافل کے لیے فرض ترک نہیں کیے جا سکتے۔

غربت کی حالت میں بیوی کے لیے سال میں تقریباً

دو سستے جوڑے اور سستا خوراک فراہم کریں، پھر

والدین کے ساتھ بھی اسی طرح فرض ادا کریں۔

پھر جب پیسے بچیں تو بیوی پر نفلی خرچ (مثلاً

گولڈن پرل وغیرہ) کر سکتے ہیں۔

مالداری میں والدین اور بیوی پر مالداری کے مطابق

خرچ فرض ہے۔

اگر مطلقہ بہن یا غیر شادی شدہ بہن ہو اور والد فوت ہو چکے ہوں، تو ان کا نان نفقہ تمام بھائیوں پر مشترکہ فرض ہے۔

چار دیواری اور صلہ رحمی:

چار دیواری میں الگ ہونا صلہ رحمی کے لیے ضروری ہو سکتا ہے، کیونکہ صلہ رحمی بہت اہم ہے۔

یہ پردہ کے طور پر بھی مفہوم رکھتا ہے، لیکن اصل مقصد صلہ رحمی ہے۔

جوائنٹ فیملی میں بھائیوں کے درمیان لڑائیاں جذباتی نفرت پیدا کر سکتی ہیں، جس سے صلہ رحمی نبھانا مشکل ہو جاتا ہے۔

نوٹ: صلہ رحمی قطع کرنے کے لیے چار دیواری میں الگ ہونا اور صلہ رحمی قائم کرنے کے لیے الگ ہونا مختلف ہیں۔ ایک مذموم ہے اور دوسرا قابل تعریف۔

واللہ تعالیٰ اعلم

مردانگی اور قرآن و حدیث

حدیث میں مفہوم ہے: پہلوان وہ ہے جو اپنے غصے کو قابو کرے۔

غصّہ یہاں تفسیر بالمثال کے طور پر استعمال ہوا ہے، یعنی جذبات۔ مطلب یہ ہوا کہ جو شخص اپنے جذبات پر قابو پا لے، وہ واقعی پہلوان اور مرد ہے۔ مردانگی کی تعریف یہ ہے کہ جتنا زیادہ کسی نے اپنے جذبات پر قابو پایا، اتنی ہی زیادہ مردانگی ہے۔

ہمبستری میں بھی بغیر بیماری کے جلدی فارغ ہونا

نامرد کہا جاتا ہے، کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ

وہ اپنے جذبات کو قابو نہیں کر سکتا۔ خواجہ سرا

اور بیمار کو عوام نامرد کا طعنہ اس لیے دیتے ہیں

کیونکہ وہ مردانگی کی صحیح تعریف نہیں جانتے۔

دل میں کوئی بٹن نہیں ہے کہ دباؤ اور جذبات

قابو میں آجائیں، تو کیا کرنا پڑے گا؟

دنیا نے موٹیویشنل سپیکرز رکھے ہوئے ہیں، لیکن

قرآن و حدیث کے بغیر بننے والے حوصلے کی مثال

قرآن میں مفہوم کے مطابق یوں دی گئی ہے: ایک کھیت جو زمینی سطح پر ہے، فصل بھی خوب دیتا ہے، لیکن جب سیلاب اور طوفان آئیں، تو ساری فصل تباہ ہو جائے۔ یہاں سیلاب سے مراد دنیاوی آزمائشیں ہیں، جیسے آئی فون یا بیوی بچوں کی فرمائشیں وغیرہ۔

قرآن و حدیث کی تعلیمات میں اتنی طاقت ہے کہ انسان کو نیکی کی طرف، خواہش کے خلاف بھی،

مائل کرتی ہیں یعنی نفس کے خلاف جہاد کرنا

ممکن ہوتا ہے۔

اسلامی نظریات کے مطابق جب نماز، روزہ وغیرہ کیے

جاتے ہیں، تو انسان اپنے آپ پر قابو پاتا ہے۔ پھر

اگر کوئی اس کی بے عزتی کرے، تو وہ رد عمل

دے سکتا ہے، لیکن محض اللّٰہ سے اجر کی امید اور

خیرخواہی کی نیت کے تحت وہ مناسب عمل کرتا

ہے۔ کبھی خاموشی مناسب ہوتی ہے، تو کبھی اخلاق کے

دائرے میں ایکشن لینا۔

جہاد فی قتال سب سے زیادہ فضیلت والا عمل ہے،

کیونکہ اس میں جذبات کے خلاف سب سے زیادہ

جہاد کرنا پڑتا ہے: دنیا کی مٹھاس، مرنے کا غم،

بیوی بچوں کی فکر، وغیرہ۔ دشمن پر وار کے دوران

بے اختیار غصہ آتا ہے اور ذاتی انتقام لینے کی

خواہش پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جہاد میں نیت صرف

اللّٰہ کے لیے برقرار رکھنا ضروری ہے، اور قرآن نے

یہی طریقہ کار سکھایا ہے: جہاد کے دوران مسلسل

اللّٰہ کا ذکر اور یاد۔

نفس کے خلاف جہاد اسلامی نظریات کی بدولت

آسان ہو جاتا ہے۔ جب عقیدہ و نظریہ صحیح ہو

جائے تو یہ تمہیں عمل کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

امام ابو حنیفہ رح فرماتے ہیں کہ ایمان صرف

تصدیقِ قلب کا نام ہے۔ یہ فرض و تقدیر کی بات

ہے، لیکن حقیقت میں اسلامی عقیدہ کے ساتھ عمل

خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں

کہ عمل کی ضرورت نہیں، بلکہ ایمان کی تعریف

کے لیے عمل ضروری نہیں۔ حقیقت میں، اسلامی

ایمان اور عمل دونوں ایک دوسرے کو مدد دیتے ہیں۔

خلاصہ: مردانگی قرآن و حدیث کے ذریعے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ مردانگی کے حصول کے لیے سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

عبادت، احسان اور تَصَوُّف

پوچھا گیا: احسان کیا ہے؟

نبی کریم ﷺ نے فرمایا، مفہوم: "اللّٰہ کی ایسی عبادت کرنا گویا کہ تم اللّٰہ کو دیکھ رہے ہو، اور

اگر ایسا نہیں کر سکتے تو ایسی عبادت کرنا کہ

یقیناً اللّٰہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔"

(صحیحین: بخاری و مسلم، متفق علیہ)

اس درجے تک عبادت کو پہنچانا کہ گویا اللّٰہ کو

دیکھ رہے ہو، اس کا طریقہ حدیث میں یہ بتایا

گیا ہے کہ عبادت کے دوران دل و دماغ میں یہ

حاضری قائم کریں کہ اللّٰہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

اس حاضری لگانے والی محنت اور تحریک کو تصوف کا نام دیا گیا۔ صوفیاء کرام نے احسان کو تصوف بھی کہا، اور صرف لفظ "تصوف" انھی نے ایجاد کیا۔ لیکن اصل تحریک احسان ہی ہے جو نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائی۔

(طریقہ کار یہ ہے کہ صوفیاء کرام کی صحیح باتوں کو اپنائیں اور کمزور باتوں سے پرہیز کریں)۔

احسان کو اپنانے کا طریقہ:

عبادت ایسے کریں گویا کہ کوئی شخص اللّٰہ کو

دیکھ کر عبادت کر رہا ہے۔ اپنے دل و دماغ کو یہ

یقین دلائیں کہ اللّٰہ تمھاری عبادت دیکھ رہا ہے۔

اللّٰہ غفور و شکور ہے: عبادت میں کوتاہی ہو تو

معاف کرے گا، اور نیکی کی قدر بے انتہا ہے۔

جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے، مفہوم: "اللّٰہ محسنین

کی نیکیاں ضائع نہیں کرتا۔"

جو شخص مذکورہ حدیث کے مطابق عبادت کرتا ہے،

وہ محسن کہلاتا ہے اور اس طرح عبادت کو احسان

کہا جاتا ہے۔

عمل خودبخود اثر نہیں دیتا، بلکہ اللّٰہ قبول کرے

تو ہی اثر ہوتا ہے۔ لہٰذا عمل کے دوران نظریں اللّٰہ

کی طرف رکھیں، اپنے عمل پر بھروسہ نہ کریں،

تاکہ تم خود کو اللّٰہ کے انتہائی درجے کا محتاج پاؤ

اور عبادت احسان کے درجے تک پہنچے۔

صوفیاء کرام فرماتے ہیں: خود کو صفر اور ناچیز

سمجھو، پھر تمھیں ہر چیز میں اللّٰہ نظر آئے گا۔

"لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰہِ"

جو اچھا ہو رہا ہے اس میں اللّٰہ نظر آئے گا، اور

جو برا ہو رہا ہے اس میں اللّٰہ کی تربیت نظر آئے

گی۔

احسان کو تزکیۃ النفس سے تعبیر کیا گیا ہے، اور

قرآن و حدیث کی تعلیمات کے ذریعے ہی احسان اور

تزکیہ نفس حاصل کیا جا سکتا ہے۔ احسان کو
اخلاص بھی کہا گیا ہے۔

درجات احسان:

بعض علماء کہتے ہیں کہ احسان کے دو درجے ہیں:

1. ایسی عبادت کرنا گویا کہ تم اللّٰہ کو دیکھ رہے ہو۔

2. ایسی عبادت کرنا کہ یقیناً اللّٰہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔

ان دونوں میں سے کوئی بھی حاصل ہو جائے تو احسان ہے۔

اور بعض اہل علم کہتے ہیں کہ احسان کا صرف

ایک درجہ ہے:

"عبادت ایسے کرنا گویا کہ تم اللّٰہ کو دیکھ رہے

ہو۔"

یہ مقصد ہے، اور "اللّٰہ تمھیں دیکھ رہا ہے" ذریعہ

ہے۔

نوٹ: ہر مومن کا ایمان ہے کہ اللّٰہ دیکھ رہا ہے۔

حدیث میں دل و دماغ میں حاضری لگانے کی بات

کی گئی ہے تاکہ عبادت کے دوران یہ یقین قائم رہے
کہ اللّٰہ دیکھ رہا ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

رب

امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں رب کی تعریف یوں کی ہے:

رب کے معنی ہیں تربیت کرنا، یعنی کسی چیز کو تدریجاً نشوونما دے کر حد کمال تک پہنچانا۔

جس طرح بدن کی تربیت کے لیے اللہ نے غذا پیدا کی، اسی طرح روح کی تربیت کے لیے وحی (قرآن و حدیث) بھیجی گئی۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا (آل عمران - 103)

"اور سب مل کر اللّٰہ کی ہدایت کی رسی کو مضبوط پکڑے رہنا۔"

اِنَّ اللہَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اللّٰہ تعالیٰ اسی کتاب کے ذریعے کچھ قوموں کو بامِ عروج تک پہنچائے گا اور اسی کو ترک کرنے کے باعث کچھ کو ذلیل و خوار کر دے گا۔" (صحیح مسلم)

اللّٰہ نے قرآن و حدیث کو رسی سے تعبیر کیا تاکہ
یہ دکھایا جا سکے کہ اگر انسان اسے مضبوطی سے
(علماً و عملاً) پکڑے گا تو یہ چونکہ اللّٰہ کی
تربیت ہے، اس کے سبب روح اوپر کی طرف پرواز
کرے گی۔ اور اگر رسی نہ تھامے تو اللّٰہ کی ربوبیت
سے محروم ہو کر روح نیچے رہ جاتی ہے۔

> وہ زمانے میں معزز تھے مسلم ہو کر
> اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

(~اقبال)

اللّٰہ کی تربیت و ربوبیت میں غفور و شکور شامل ہیں۔ مومن قیامت کے دن اپنے ساٹھ ستر سال کی زندگی میں رب کی تربیت کا نتیجہ دیکھ کر کہیں گے:

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۝ (فاطر - 34)

ترجمہ:

"وہ کہیں گے کہ اللّٰہ کا شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کیا، بیشک ہمارا رب بخشنے والا اور قدردان ہے۔"

رب مختلف قسم کی تکالیف کے ذریعے گناہ کو مٹانے، نیکیاں بڑھانے، علم میں اضافہ کرنے وغیرہ

میں مدد دیتا ہے، یعنی تربیت دے کر حد کمال
تک پہنچاتا ہے، اور انتہا جنت ہے۔

اس لیے خوش قسمت ہے وہ جو رب کی تربیت اور
ٹریننگ قبول کرے، کیونکہ اللّٰہ کی ربوبیت حاصل
کرنے والا حد کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ اور جو
رب کی ربوبیت و تربیت کو جھٹلاتا ہے، وہ نیچے
ہی رہ جاتا ہے۔

خلاصہ:

اللّٰہ کی طرف سے روح کی تربیت و ٹریننگ قرآن و حدیث کے ذریعے ہے، جس کے سبب روح اوپر پرواز کرتی ہے اور نیک بندوں میں شمار ہوتی ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

رب اور جنت و جہنم

رب کے معنی ہیں تربیت کرنا، یعنی کسی چیز کو تدریجاً نشوونما دے کر حد کمال تک پہنچانا۔ (مفردات القرآن)

اللّٰہ کی ربوبیت جنت اور جہنم کا سبب ہے۔ جس کو اللّٰہ کی ربوبیت حاصل ہو جاتی ہے، وہ حد کمال

تک پہنچتا ہے، اور اس کا نتیجہ جنت ہے، کیونکہ
اللّٰہ کی ربوبیت اور تربیت مخلوق جیسی معمولی
تربیت نہیں کہ صرف عارضی یا فانی فائدہ حاصل
ہو جائے۔

اور جو اللّٰہ کی ربوبیت اور تربیت سے محروم رہتا
ہے، وہ زلیل و خوار رہتا ہے، اور اس کا نتیجہ
جہنم ہے۔

اسی لیے آخرت سے منکر کے بارے میں اللّٰہ فرماتا ہے کہ وہ کچھ نہیں، بس اللّٰہ کی ربوبیت کا (بواسطہ) انکار کرتے ہیں:

وَ اِنۡ تَعۡجَبۡ فَعَجَبٌ قَوۡلُهُمۡ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ۬ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ ۚ (الرعد – 5)

ترجمہ: "اگر تم عجیب بات سننا چاہو تو کافروں کا یہ کہنا عجیب ہے کہ جب ہم مر کر مٹی ہوجائیں

گے تو کیا از سر نو پیدا ہوں گے؟ یہی لوگ ہیں

جو اپنے رب سے منکر ہوئے ہیں۔"

(یاد رہے: یہاں کفر کا مفہوم بالواسطہ ربوبیت کے

انکار سے ہے، نہ کہ صرف اللّٰہ کی موجودگی کے انکار

سے۔)

اللّٰہ کی تربیت و ربوبیت وحی (قرآن و حدیث) کے

ذریعے ہے۔

جو شخص اللّٰہ کی ربوبیت و تربیت کا طالب ہو

جائے، وہ ہمیشہ کے خسران سے محفوظ رہتا ہے۔

اللّٰہ کی ربوبیت حاصل کرنے کے لیے صبر کرنا،

عقل مندوں اور جنتیوں کی خصلت ہے، یعنی صبر

میں مقصد اللّٰہ کی تربیت کا فائدہ حاصل کرنا ہے

تاکہ حد کمال تک پہنچا جا سکے اور جنت نصیب

ہو۔ (مفہوم: الرعد - 22)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ اللّٰہ کی

معرفت میں ہے۔ اللّٰہ کی معرفت کے حصول میں

محنت کریں، باقی علم اس کے تابع ہے اور خود
بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ اسی لیے اللّٰہ کی معرفت
میں کوتاہی (شرک) بغیر توبہ معاف نہیں کی جاتی۔

واللہ تعالیٰ اعلم

فرعون

عرف عام میں مصر کے بادشاہ کو فرعون کہا جاتا
تھا۔

قرآن و حدیث کی اصطلاح میں فرعون ہر اس
شخص کو کہا جاتا ہے جو اللّٰہ کے قوانین کو
جھٹلاتا ہے۔

اللّٰہ کے قوانین کو جھٹلانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ
انسان جس قدر ظلم کی خواہش رکھتا ہے، وہ کرتا

رہے گا بشرطیکہ اس میں ظلم کرنے کی طاقت موجود ہو، اور ظلم کے ازالے کی بھی کوئی کوشش نہ کرے۔

اللّٰہ نے مثال کے طور پر موسیٰ علیہ السلام کے دور کے فرعون کو بھرپور طاقت دی تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ جو شخص اللّٰہ کے قوانین جھٹلاتا ہے اور مجبوری میں ظلم نہیں کرتا ہے، وہ شرافت والا ہے۔

موسیٰ والے فرعون نے زمین و آسمان کی پیدائش کا
دعویٰ نہیں کیا بلکہ صرف خود ساختہ قوانین نافذ
کیے۔ اسی وجہ سے فرعون کو خدائی دعویدار قرار
دیا گیا۔

اس دور کے فرعون کے پاس زیادہ طاقت تھی، لیکن
آج کل کے فرعون یعنی قرآن و حدیث کے مخالف
سیاستدان، کم طاقت سے ظلم کرتے ہیں۔ مثال کے
طور پر، موجودہ دور کے بعض حکمران اربوں روپے
سڑک کی تعمیر پر خرچ کر کے باقی رقم اپنے لیے

رکھ لیتے ہیں اور عوام بھی خوش ہوتے ہیں، جبکہ

ضرورت مندوں یا معذوروں کو بقدر ضرورت نہیں

دیتے۔ یہ بھی وہی موسیٰ کے فرعون کا دعویٰ ہے:

"معیشت میرے قبضے میں ہے۔"

(نوٹ: اقتصادیات میں انسان کا مجازی اختیار بھی

نقصان دہ ہے، اسی لیے قدرتی سونا اور قدرتی چاندی

اصل کرنسی ہیں، کیونکہ قدرتی کرنسی میں کرپشن

آسان نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم)

موسیٰ کے فرعون نے بچوں کو قتل کیا اور بچیوں کو خدمت کے لیے زندہ رکھا۔ آج کے دور کے فرعون نے لڑکوں کو آسمانی علم (قرآن و حدیث) سے دور رکھا اور عورتوں کو دنیاوی تعلیم یافتہ بنا کر عہدے دیے، ویمن ڈے منایا اور خانہ داری کو متاثر کیا۔

حاصل یہ ہے کہ فرعون اور موسیٰ کا واقعہ صرف قصہ نہیں، بلکہ عقل والوں کے لیے پیغام اور نمونہ

ہے کہ اللہ کے قوانین کو جھٹلانے والوں کا انجام

کیا ہوتا ہے۔

اصل میں اللہ کے قوانین یعنی قرآن و حدیث کے

صحیح نظریات میں انقلاب ہے، جو انسان کو معصوم

تو نہیں بناتا لیکن مغفرت اور اصلاح فراہم کرتا

ہے۔ اسی انقلاب سے ہر فرعون، جو ظلم کی خواہش

اور استطاعت رکھتا ہے، بغیر روک ٹوک ظلم کرتا

رہے گا، جبکہ مومن اپنے ظلم اور گناہوں کا ازالہ

کرتا ہے۔

اسلامی نظریات میں ہی امن اور زندگی ہے، لیکن یہ جمہوریت کے راستے نہیں آتا، کیونکہ اکثریت قرآن و حدیث کے مطابق نہیں ہوتی:

اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۞ البقرہ – 100

وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۞ آل عمران – 110

وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۞ المائدہ – 103

أَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۞ انعام – 37

أَكۡثَرَهُمۡ يَجۡهَلُوۡنَ ۞ انعام – 111

وَأَكۡثَرُهُمۡ لِلۡحَقِّ كٰرِهُوۡنَ ۞ المؤمنون – 70

اکثریت اپنے جیسے کو ہی قائد یا وزیراعظم منتخب کرے گی، اس لیے جمہوریت کے ذریعے اسلام نافذ نہیں ہو سکتا۔

اسلام ایک انقلابی تحریک ہے اور یہ ہمیشہ طاقت کے ذریعے ہی قائم ہوتی ہے۔

نوٹ: تمام انسانوں میں فرعونیت چھپی ہوئی ہے۔ وحی (قرآن و حدیث) کا علم اس فرعونیت کو دور کرنے میں مدد دیتا ہے، جسے مغفرت کہتے ہیں۔ جبکہ وحی کو جھٹلانے والا اپنے فرعونیت کو درست نہیں کر سکتا۔

واللہ تعالیٰ اعلم

رسول اللہ

اعْبُدُوا اللّٰہَ

اللہ کی عبادت کرو۔

عبادت میں یہ بھی شامل ہے کہ ہم صرف اور

صرف اللہ کے احکامات اور قوانین کے پابند ہیں۔

باقی احکامات (مثلاً والدین، بادشاہ وغیرہ) کی پابندی

اللہ کے حکم کی وجہ سے ہے۔ اس میں اللہ کی

تربیت ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اللہ تو ہم سے ہم کلام نہیں

ہوتا کہ ایمان بالغیب ختم ہو جائے گا۔ تو اللہ کے

احکامات کیا ہیں؟

اس کے لیے اللہ نے اپنے احکامات کو مجسمہ بنا کر

بھیجا۔ اسی کو رسول سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

رسول اللہ سے مراد اللہ کے (تشریعی) احکامات کا

مجسمہ ہے۔

انبیاء علیہم السلام جب دعوت دیتے تھے کہ

اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ ۙ﴿۱۰۷﴾ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۰۸﴾ۚ

الشعراء 107-108

ترجمہ: میں تمہارا امانتدار رسول ہوں تو اللہ سے

ڈرو اور میری تابعداری کرو۔

"میں رسول ہوں" کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ کے

احکامات کا مجسمہ ہوں۔ اللہ سے ڈرنے کا تقاضا یہ

ہے کہ اللہ کے احکامات کو حق سمجھ کر (اور باقی

قوانین کو باطل سمجھ کر) تابعداری کریں، اور

چونکہ میں اللہ کے احکامات کا مجسمہ ہوں، میری

تابعداری اصل میں اللہ کے احکامات اور قوانین کی

تابعداری ہوگئی، اس لیے میری تابعداری کرو۔

موسیٰ علیہ السلام کو تورات سے تعبیر کیا جاتا ہے

اور تورات کو اللہ کے احکامات کا مجسمہ کہا جاتا

ہے۔ اسی طرح انجیل اور عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے

احکامات کا مجسمہ ہیں۔

محمد ﷺ کو قرآن و حدیث سے تعبیر کیا جاتا

ہے اور قرآن و حدیث کو اللہ کے احکامات اور

قوانین کہا جاتا ہے۔

پہلے انبیاء خاص قوم اور دور کے لیے بھیجے جاتے

تھے اور محمد ﷺ کو تمام لوگوں اور ہر دور کے

لیے بھیجا گیا ہے، یعنی قرآن و حدیث قیامت تک

مناسب اور غیر منسوخ ہے۔ اور محمد ﷺ خاتم

النبیین ہیں۔

قُلْ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الاعراف

– 158

ترجمہ: اے محمد ﷺ کہہ دو کہ لوگوں! میں

تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

کسی خاص قوم کے لیے نہیں بلکہ سب کے لیے

محمد ﷺ اللہ کے احکامات کا مجسمہ ہیں۔

یہ ایمان لانا ضروری ہے کہ قرآن و حدیث محمد

ﷺ پر نازل ہوا ہے اور محمد ﷺ قرآن و

حدیث کا عملی مجسمہ ہیں۔ کسی اور پر نازل

ہونے کا دعویٰ کفر ہے۔

رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنَ بِنَبِيِّهِ وَآمَنَ بِمُحَمَّدٍ

(بخاری و مسلم)

ترجمہ: اہل کتاب میں سے وہ شخص جو اپنے نبی

پر ایمان لایا اور پھر محمد ﷺ پر ایمان لایا۔

اس حدیث میں نام لکھا ہے کہ محمد ﷺ پر

ہی ایمان لائے گا کہ آپ ﷺ پر قرآن و حدیث

نازل ہوا ہے۔

یہ بھی قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ محمد

ﷺ انسانوں کی طرح انسان ہیں۔ ان کی ذات نور

نہیں ہے، البتہ ان کی صفت نور ہے کیونکہ قرآن و

حدیث نور ہے اور محمد ﷺ قرآن و حدیث کا

مجسمہ ہیں، اسی وجہ سے آپ ﷺ کی صفت نور ہو گئی۔

اسی طرح قرآن و حدیث یعنی اللہ کے احکامات اور قوانین رحمت للعالمین ہیں اور محمد ﷺ قرآن و حدیث کا مجسمہ ہونے کے سبب رحمت للعالمین ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ "اللہ اور رسول" سے مراد اللہ اور اللہ کے احکامات ہیں۔ ایک اور مطلب یہ ہے کہ "اللہ اور رسول" ایک ہی حاکم ہیں۔ اللہ اور رسول

کو جدا کرنا یعنی دو حاکم سمجھنا کفر ہے، کہ

ایک اللہ کی ذات اور دوسرا محمد ﷺ کی ذات۔

اس کا اشارہ اس آیت میں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا

بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (النساء - 150)

ترجمہ: جو لوگ اللہ سے اور اس کے رسولوں سے

کفر کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں میں

فرق کرنا چاہتے ہیں۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ

يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۞ التوبہ - 62

ترجمہ: یہ لوگ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں

کھاتے ہیں تاکہ تم کو خوش کردیں۔ اللہ اور رسول

زیادہ مستحق ہیں کہ اس کو خوش کریں اگر وہ

(دل میں) مومن ہوتے۔

(يُّرْضُوْهُ) میں ضمیر مفرد ہے۔

اس آیت میں اللہ اور رسول کو ضمیر مفرد میں

جمع کیا گیا، جس میں اشارہ ہے کہ اللہ اور رسول

ایک ہی ہیں، جس سے مراد (حاکمیت کے اعتبار

سے) اللہ اور اللہ کے احکامات ہیں، نہ کہ اللہ اور

محمد ﷺ کی ذات۔

اور دوسری بات، منافقین قسمیں محمد ﷺ کی

ذات کو خوش کرنے کے لیے بھی کھاتے تھے، پھر

بھی آیت میں کہا گیا کہ اللہ اور رسول زیادہ

مستحق ہیں کہ خوش کرنے کی کوشش کی جائے۔

واللہ تعالیٰ اعلم

اسی طرح جس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا کہ وہ مومن نہیں جس کو میں سب سے

زیادہ محبوب نہ بن جاؤں،

اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر اللہ کے احکامات اور

قوانین (قرآن و حدیث) سب سے زیادہ محبوب نہ

ہوں تو وہ مومن نہیں۔

اللہ کے قوانین کو سب سے زیادہ محبوب سمجھنے کا

ادنیٰ تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے احکامات اور قوانین

(قرآن و حدیث) کو حق سمجھا جائے اور دوسرے

تمام (غیر اللہ کے) قوانین کو باطل سمجھا جائے،

اور یہ طے کیا جائے کہ اپنی استطاعت کے مطابق

اللہ کے احکامات اور قوانین کی تابعداری کروں گا۔

محمد ﷺ کی ذات سے محبت، اللہ کے لیے بندوں

سے محبت کے زمرے میں آتی ہے۔

محمد ﷺ کی ذات سے مکہ کے مشرکین کی

دشمنی نہیں تھی بلکہ رسالت سے تھی۔

اکیلے محمد ﷺ کی ذات سے محبت فائدہ نہیں

کرتی جب تک کہ رسالت سے نہ کی جائے۔ رسالت

سے سب سے زیادہ محبت کرنے کا تقاضا اوپر بیان

کیا گیا۔

اسی طرح جس حدیث میں ہے کہ (مفہوم) اللہ اور

رسول کا امن اس کو حاصل ہوا جس محارب کافر

نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللہ تسلیم کیا،

اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ کے عذاب سے اور

اللہ کے تشریعی قوانین میں (جہاد فی قتال کے ذریعے

سے) مامون ہوگیا، اور اب یہ محارب کافر نہیں رہا

اور اس پر مسلمانوں کے قوانین نافذ ہوئے۔

اسی طرح جس حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا کہ

(مفہوم) مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں عطا کی

گئی ہیں،

اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے احکامات میں زمین

کے خزانے پوشیدہ ہیں۔ جو تشریعی خدمات میں

مصروف ہو گیا، اللہ کی تکوینی خدمات اس کے تابع

کیا جائے گا۔

محمد ﷺ کی ذاتی حکم، اللہ کے حکم کی وجہ

سے فرض ہے، جس طرح بادشاہ، والدین، خاوند

وغیرہ کا حکم فرض ہے۔

محمد ﷺ کی ذاتی حکم دوسروں سے ممتاز ہے،

لیکن اللہ کے حکم کی وجہ سے۔

محمد ﷺ جب دنیا میں قاضی بن کر فیصلہ

کرتے اور کوئی اس فیصلے کو تسلیم نہ کرتا، خوش

نہ ہوتا، تو وہ مومن نہ ہوتا بلکہ منافق ہوتا۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ

ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا

تَسْلِيْمًا ۞ النساء - 65

ترجمہ: تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک

اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو

فیصلہ تم کردو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں،

بلکہ خوشی سے مان لیں، تب تک مومن نہیں ہوں

گے۔

اس آیت میں محمد ﷺ کی قاضی ہونے کا امتیاز

بتایا گیا ہے۔ اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے

قوانین اور احکامات کی بجائے کسی اور قوانین کو

حق سمجھ کر فیصلہ کروانا کفر ہے۔

منکرین حدیث اس بات کو سمجھتے نہیں ہیں کہ

حدیث بھی اللّٰہ کی طرف سے ہے، اس لیے احادیث

سے انکار کرتے ہیں یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم صرف

اور صرف اللّٰہ کے احکامات کے پابند ہیں۔

حدیث بھی اللّٰہ کے احکامات میں سے ہی ہے۔

جس طرح قرآن نازل ہوا ہے، اسی طرح بعض احادیث بھی نازل ہوئی ہیں۔

اور اسی نازل کردہ قرآن و حدیث میں خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کا اجتہاد اور فقہ بھی حدیث کہلاتا ہے۔ اس وجہ سے کہ اللّٰہ نے رسول اللّٰہ ﷺ کی مطلق تابعداری کا حکم دیا ہے، کوئی شرط نہیں لگائی ہے۔ لہٰذا محمد ﷺ کا اجتہاد اور فقہ یعنی حدیث ہمارے لیے حجت اور دلیل ہے۔

(مزید اس کی تفصیل کے لیے "مائی ورک آن اسلام

جلد 2" میں حاکمیت اور حاکمیت کا مسئلہ

ملاحظہ کریں)

قرآن و حدیث میں جو حکمت ہوتی ہے، وہ اگر غیر

نبی ماخوذ کی جائے تو فقہ کہلاتی ہے، جبکہ محمد

ﷺ ماخوذ کریں تو حدیث کہلاتی ہے۔

اور اگر بالفرض و تقدیر احادیث کا اعتبار ختم

کیا جائے، تو پھر جو حکمت اور مفہوم قرآن سے

نکالی جاتی ہے، وہ کس کی معتبر ہوگی جب محمد

ﷺ کی حکمت معتبر نہ ہوئی؟

جبکہ اللّٰہ نے قرآن میں کئی جگہ فرمایا ہے کہ

(مفہوم):

"ہم نے اسے کتاب، حکمت اور نبوت عطا کی۔"

اس آیت میں حکمت سے مراد یہی ہے کہ کتاب

کی سمجھ عطا کی گئی۔

اسی سمجھ اور فقہِ نبی کریم ﷺ کو حدیث

کہا گیا ہے۔

اس پوسٹ کے چند فوائد:

- نظریں اللّٰہ پر رہیں گی۔

- یہ پتہ چلے گا کہ ہم غلامی کس کی کرتے ہیں۔
- بریلویّت پر رد، اُن کے دلائل ناکارہ ہوئے۔
- بریلوی تو صاف لفظوں میں محمد ﷺ کو اللّٰہ کے ساتھ (محبت/حاکمیت وغیرہ میں) شریک ٹھہراتے ہیں، بس اس کو عنوان کچھ اور دیتے ہیں، جبکہ اکثر مسلمان اسی محبت اور حاکمیت میں شریک تو کرواتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم

—

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم ۔